انسانوں کو سدھانا



سبطِ حسن

اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اترے

فیضؔ

اصل بات

اگر کوئی صورتحال کسی شخص کے لئے نا قابل قبول ہو اور اس کی موجودگی سے بے قراری بڑھ جائے تو وہ اس پر ردعمل ظاہر کرے گا۔ ردعمل کی ایک صورت غصہ کرنا یا اس صورتحال سے فرار ہو سکتا ہے۔ ہم جس صورتحال میں جی رہے ہیں وہ کئی ہزار سال کے یکطرفہ جبر کے نتیجے میں ہم تک پہنچی۔ اس جبری نظام میں تہہ در تہہ اپنی حفاظت کا بندوبست موجود ہے۔ اگر اس نظام پر ناراضگی یا عدم اطمینان ظاہر کر بھی دیا جائے تو بھی جان نہیں چھوٹتی۔ یہ نظام اپنی چال بازیوں سے کسی بھی فرد کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ واپس قبولیت کے دائرے میں چلا آئے۔ اس طرح جزوی انکار سوائے پشیمانی یا ہذیان پیدا کرنے کچھ نہیں کر پاتا۔

انکار کی ایک صورت یہ ہے کہ یہ جاری تاریخی عمل کے اندر سے پھوٹے۔ ایسا انکار زندگی اور انسان کے شعور کے ہر پہلو پر نظر ثانی کی گنجائش رکھتا ہے۔ صرف گنجائش ہی نہیں، تبدیلی کے وسیع امکانات اپنے اندر سموئے ہوتا ہے۔ ان معنوں میں انکار کی یہ صورت کلی اور ہمہ گیر ہوتی ہے۔

اس وقت ہمارے ہاں بیک وقت قدیم جاگیرداری اور نو آبادیاتی نظامات پر مبنی مزاج جاری وساری ہے۔ ان دونوں کو ایک مخصوص ماورائی نظریے کی بنیاد پر قبولیت کا جواز مہیا کیا گیا ہے۔ پھر جدید صارفانہ مزاج (Consumerism) نے رہی سہی کسر نکال دی اور کوئی بھی شخص اس تہہ در تہہ خلفشار میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ اس صورتحال سے نکلنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے کلی انکار۔۔۔۔۔

انسانی تاریخ میں اہم معاشرتی اور شعوری تبدیلیاں اسی کلی انکار کی بدولت ہی ممکن ہوئیں۔ مثال

کے طور پر جب یورپ میں فیوڈلزم اپنی نشوونما کی ممکنہ حدود کو چھونے لگا تو اس نظام میں رہنے والے لوگوں کی زندگیوں میں مصائب بڑھنے لگے۔ اپنی انتہائی صورت میں اس نظام میں مصائب کو کم کرنے کی اہلیت بھی نہ تھی۔ ایسے میں تاجروں نے نئے سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد رکھی۔ فیوڈلزم سے کلی انکار کی گنجائش موجود تھی کیونکہ اس انکار کا جواز خود تاریخی عمل سے بھی میسر تھا۔ تاریخی عمل ہی اس انکار کی تحریک دے رہا تھا اور انکار کے بعد ممکنہ تبدیلیوں کا اشارہ بھی تاریخی عمل سے لیا جا رہا تھا۔ اسی کلی انکار کی بدولت اقتصادی نظام بدلا، پرانے اقتصادی نظام کو تحفظ فراہم کرنے والے سماجی اور ماورائی شعور میں تبدیلیاں آئیں۔ قدیم ریاستی نظام، انکار کے بعد بننے والے ماحول کو مستعد کمک فراہم کرنے سے قاصر تھا، لہٰذا اس کی جگہ ایک نیا ریاستی نظام پیدا ہوا۔

اصل بات یہ ہے کوئی بھی نظام جب اس میں بسے انسانوں کے لئے آزار بن جائے تو اس کو جزوی انکار سے بہتر نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے لئے کلی انکار کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ انکار ہمہ جہتی اور اپنے عمل میں بامعنی ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تاریخی طور پر ایسی صورتحال موجود ہے، جس میں کلی انکار کی گنجائش موجود ہے۔ جاری نظام انفرادی اور اجتماعی سطح پر خلفشار پھیلا رہا ہے اور اس میں کسی بھی انسان کی آسودگی (مادی و نفسیاتی) کا سامان ہرگز میسر نہیں۔ اس نظام کی بنیاد جن ماورائی تصورات پر ہے، ان کے جادوئی تأثر کو ختم کرنا پہلا کام ہے۔ اس سے انسان اپنی حقیقی صورتحال میں جینا شروع کریں گے۔ اس سے فوری طور پر ناقدانہ شعور کا عمل شروع ہوگا جو خود بخود انسان کو اس حقیقی تاریخی عمل سے جوڑتا جائے گا اور ہمہ گیر تبدیلی کا عمل درجہ بدرجہ آگے بڑھتا جائے گا۔

زیر نظر کتاب کلی انکار کے لیے ضروری دلائل اور تاریخی شہادت مہیا کرتی ہے۔ اس کا مطالعہ بہتر انسانی زندگی کے لیے امکانات پیدا کرنے کی گنجائش رکھتا ہے۔

سید قمر عباس
سابق صدر شعبہ تاریخ،
پنجاب یونیورسٹی، لاہور

پہلی بات

فرض کریں کہ ایک شخص مجبوری کی صورت حال میں رہ رہا ہے۔ مجبوری کی اس صورت حال میں، اس کی مرضی کے خلاف اسے استعمال کیا جا رہا ہے۔ وہ اس قدر مجبور ہے کہ کوشش کے باوجود اس مجبوری کی صورت حال سے بھاگ نہیں سکتا۔ یہی نہیں، اس کو استعمال کرنے والے نے اس مجبور کا ایسے تصورات (Illusions) پر یقین دلا دیا ہے کہ جن کی بدولت وہ ایک خیالی آزادی کا سکون تو محسوس کرتا ہے لیکن وہ بدستور مجبوری کی زندگی ہی بسر کرتا ہے۔ محض سکون ہی نہیں وہ 'آزادی کے اعلیٰ مقصد' جو فوری طور پر اس کی زندگی سے ہرگز ممکن نہیں، کے لیے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہ اسے بارہ گھنٹے روزانہ کام کرنے میں چار گھنٹوں کی چھوٹ مل جائے گی اور جب اس کی مشقت کے چالیس برس گزر جائیں گے تو اس کو ایک مکان ملے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اگر وہ اس عرصے کے دوران مر جائے تو ان سہولیات کا فائدہ کسی قدر اس کے ایک لڑکے کو یا بیوی کو مل سکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ مجبوری کے اس لمبے سفر کی ابتدا اگر اس شخص نے بیس برس کی عمر میں کی تو آئندہ چالیس برس تک ہی وہ بہترین کارکردگی دے سکتا ہے۔۔۔ یہی تو اس کی زندگی کا اصل دورانیہ ہوگا۔ اگر اسے ان شرائط پر استعمال کر لیا گیا تو پھر اس شخص کی زندگی بچے گی کہاں اور اگر وہ بچ گیا تو گھر بے معنی ہوگا۔ اس ساری صورت حال میں دراصل یہ ہوا کہ اس شخص کو ساری زندگی کے لیے مجبور بنا کر اس کی زندگی اور زندگی کی قوت کو جابر نے استعمال کر لیا۔

مجبور نے اگر جابر کی شرائط پر یقین کر لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے مجبوری برقرار رکھنے کے لیے ضروری تصورات اور ان سے پیدا ہونے والے علم کو دراصل مان لیا۔ جب تک وہ اس علم یا تصورات کو اپنی زندگی کی بنیاد مانتا رہے گا، وہ مسلسل مجبور رہے گا۔ اگر وہ اپنی زندگی کی جاری صورت

حال پر سوال اٹھائے، ان سوالات کے جواب ڈھونڈے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنی جاری زندگی سے نہ صرف یہ کہ خوش نہیں، وہ اسے بدلنا چاہتا ہے۔ اُس کی یہی سوچ تبدیلی کی شروعات کی بنیاد بنے گی۔ ان سوالات کے جوابات ڈھونڈنے سے اس مجبور کو ان باتوں کا پتا چلے گا جو اس کی مجبوری کی صورت حال کو تبدیل کرنے کے امکانات پیدا کرسکتی ہیں۔ باتیں، جو تبدیلی لاسکتی ہیں، اصل میں مجبوری سے متعلق تصورات سے مختلف ہوں گی— یعنی ایک نئی سوچ، نیا علم ہوگا۔

تبدیلی لانے کے لیے نیا علم ہی کارگر ہوسکتا ہے اور نیا علم صرف سوال اٹھانے اور مکالمہ کرنے سے ہی ممکن ہے۔

ممکن ہے کہ وہ مجبور شخص، جو اپنے حالات کو تبدیل کرنے کے لیے نیا علم پیدا کررہا ہے، اپنی زندگی میں اپنی صورت حال تبدیل نہ کرسکے مگر وہ نیا علم خواہ وہ کس قدر محدود ہو، اس کے بعد آنے والوں کے لیے تبدیلی کا امکان یا شروعات بن سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ اس نے بڑ کا ایک ننھا سا پودا لگا دیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنی زندگی میں اس درخت کی چھاؤں میں نہیں بیٹھ پائے گا مگر اس کے بعد آنے والے ضرور اس کی ٹھنڈی چھاؤں کا لطف لیں گے۔ آئندہ آنے والوں کے لیے درخت لگانے کا خیال، نفع نقصان یا ذاتی غرض سے الگ دراصل انسانوں سے وسیع تر رشتے کا اقرار ہے۔ اس اقرار کے بعد انسان یقین کرلیتا ہے کہ اس کی اچھی زندگی یہ نہیں کہ اس نے خود کس قدر آسانیاں حاصل کیں یا کس قدر کامیاب زندگی گزار لی— اچھی زندگی یہ ہے کہ کس طرح آپ نے آئندہ آنے والوں کے لیے آسانیوں کے امکان یا مجبوری کی صورت حال میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح کوئی بھی شخص انسانی زندگی کے وسیع تر بہتے دھارے سے آلائشوں کو نکال کر اسے آنے والوں کے لیے مفید بنا دیتا ہے۔

اس کتاب میں ان بنیادی سوالات کو اٹھایا گیا ہے جو تبدیلی کے لیے نیا علم پیدا کرنے کی گنجائش رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں تاریخی طور پر ان معاملات کی نشاندہی کی گئی ہے جن کے باعث مخصوص تصورات (Concepts)، عقائد (Beliefs) اور اعمال (Practices) پیدا ہوئے۔ یہ تصوّرات

دراصل انسانوں کو سدھانے کا معاملہ تھا اور اس کے نتیجے میں ہی آج ہم سب بے اختیار ہیں۔ اس بے اختیاری اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مجبوری کے باعث صرف مجبور ہی نہیں، جابر بھی اپنی انسانی حیثیت اور مقام کھو بیٹھے ہیں۔ اگر مجبور لوگ اپنی مجبوری کو سمجھنے سے قاصر ہیں تو جابر بھی ایک وسیع تر ابہام کے باعث ایک الجھن میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس ساری صورت حال میں اوّل تو انسان کا حقیقی رنگ غائب ہے، اگر کچھ بچ گیا ہے تو وہ ادھورا سا ہے۔

اس غیر انسانی صورت حال سے نکلنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ سوال اٹھائے جائیں۔ آپس میں ان سوالات پر بات ہو۔ سب انسانوں کو سوال اور بات چیت کے عمل میں شامل رکھتے ہوئے تبدیلی کے امکانات اور حقیقی تبدیلی کے لیے اقدام کیے جائیں۔

زیرِ نظر مطالعہ اپنے نفسِ مضمون کے اعتبار سے خاصا پیچیدہ ہے تاہم کوشش کی گئی ہے کہ اسے قاری کے لیے آسان بنایا جائے۔ اکثر اصطلاحات جب اردو میں تبدیل کی جائیں تو وہ بوجھل ہو جاتی ہیں، اس لیے ان کے متبادل انگریزی میں دے دیے گئے ہیں۔ اکثر مشکل معاملات کو مثالیں اور موزوں کہانیاں دے کر سہل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں مباحث کی ترتیب یہ ہے:

1- اپنوں کے ہاتھوں، پیاروں پر ظلم

ایک بچی کی تربیت کے حوالے سے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح تربیت کے نام پر اپنے سگے اپنے پیاروں پر ظلم کر جاتے ہیں۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ وہ روایت کے مطابق اپنا فرض ادا کر رہے ہیں مگر دراصل وہ مجبوری کی روایت کو آنے والی نسلوں تک بڑھا دیتے ہیں۔ اس طرح وہ تاریخی جبر کے تسلسل میں ایک آلۂ کار بن کر خود اپنے پیاروں کو مجبوری کی زندگی میں جھونک دیتے ہیں۔

2- انسانوں کو سدھانے کی روایت

اس باب میں محتاجی پیدا کرنے کی روایت پر بحث کی گئی ہے۔ کس طرح طاقتور گروہ پیدا ہوا؟ اس گروہ نے اپنی غرض مندیوں کے لیے کس طرح لوگوں کو محتاج بنایا کس طرح اس اقلیتی گروہ نے

اکثریت کو استعمال کیا؟ قدیم دور میں کس طرح اس محتاجی کی روایت پیدا ہوئی؟ کس طرح اس روایت کا بادشاہوں اور جدید سرمایہ دارانہ نظام میں تسلسل جاری رہا؟

3- انسانوں کو سدھانے کے طریقے

لوگوں کو ان کے احوال سے الگ کر کے استعمال کرنے کے لیے کن طریقوں سے کیسے کام لیا گیا۔ اس سلسلے میں تجریدیت، واہموں اور دیگر تصورات کو عملی طور پر استعمال کیا گیا۔ ان تمام طریقوں کا مقصد بنیادی طور پر یہی تھا کہ لوگ اپنے حقیقی حالات پر سوال کرنے اور ان کو تبدیل کرنے کے شعور سے الگ رہیں۔

4- تحکمانہ نظام اور سدھانے کا عمل

مجموعی طور پر محتاجی کی روایت تحکمانہ نظام کے تحت ایک وسیع تر شکنجے کی صورت میں پیدا ہوئی۔ کیسے انسان کو اس کی انسانی حسیات سے الگ کر کے اس نظام کا پرزہ بنا دیا جاتا ہے؟ اس میں کس طرح انسان بے بسی میں رہنا سیکھتا ہے؟ وہ کیسے اپنے حقیقی حالات سے الگ ہو کر لاتعلق بن جاتا ہے؟ وہی حالات جو مجبور بناتے ہیں وہ ان پر سوال نہیں اٹھاتا بلکہ محتاجی اور تقدیر پرستی کو ہی ان حالات کا ذمے دار سمجھنے لگتا ہے۔

5- ناقدانہ شعور

محتاجی اور مجبوری کی روایت کو ختم کرنے کے لیے کس طرح نیا علم پیدا کیا جا سکتا ہے؟ کیا ایسا کرنا ممکن ہے؟ اس باب میں سوال کرنے اور مکالمے کی مدد سے نیا علم پیدا کرنے کی اہمیت پر بحث کی گئی ہے۔

کتاب میں ضروری حوالہ جات دیے گئے ہیں۔ تاہم کچھ باتیں جو مختلف مصنفین کی کتابوں سے لی گئیں مگر ان کے حوالہ جات ملنا ممکن نہ تھے کی نشاندہی ان کے ناموں سے کر دی گئی ہے۔

1

اپنوں کے ہاتھوں، پیاروں پر ظلم

زارا، نو برس کی دبلی پتلی نازک سی بچی ہے۔ چہرے کی رنگت پیلی ہے مگر نقوش نازک۔ ایک نظر دیکھتے ہی فوراً احساس ہو جاتا ہے کہ زارا بہت ذہین اور حساس بچی ہے۔ زارا بہت کم بولتی ہے مگر اس کی آنکھوں سے ہمیشہ یہ تاثر جھلکتا ہے کہ جیسے وہ ہر بات کو بڑی گہرائی اور احساس سے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ زارا کے ابو لکڑی کا بڑا عمدہ کام کرتے ہیں۔ اس کی امی سیدھی سادی روایتی ماں ہیں۔

پچھلے کچھ دنوں سے زارا کو جاگتے ہوئے بھی ایک سر کٹا بھوت دکھائی دینے لگا ہے۔ وہ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ بیٹھی ہوتی ہے کہ اچانک ہاہا کار مچا دیتی ہے:

''ابو مجھے بچالو۔۔۔ یہ مجھے مار ڈالے گا۔۔۔''

جب سے زارا نے ڈرنا شروع کیا، اس کے ابو نے کام پر جانا چھوڑ دیا ہے۔ وہ ہر وقت اس کے پاس ہی رہتے ہیں۔ اگر وہ پاس نہ ہوں تو زارا، خوف کی حالت میں گھر سے باہر چلے جانے کے لیے بھاگتی ہے۔ وہ اس حالت کے دوران اپنی ماں کے ہرگز قریب نہیں آتی اور نہ ہی اسے ہاتھ لگانے دیتی ہے۔ گھر والوں نے بہتیرے تعویز گنڈے اور دَم درُود کروائے مگر زارا کی صورت حال میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ زارا، پانچ چھے سال کی عمر سے ہی خاموش اور دبی دبی سی رہنے لگی تھی۔ اس سے پہلے وہ بڑی شرارتی اور چلبلی تھی۔ اب وہ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ تو رہتی ہے، مگر کسی قدر کھچی کھچی سی۔ کھیل کود اور بچوں کے دیگر مشغلوں میں حصہ نہیں لیتی۔ بس گم سم سی بیٹھی رہتی ہے۔ سکول جانا ہو یا گھر پر رہنا ۔۔۔۔ دونوں جگہوں سے اسے بے قراری ہوتی ہے۔ اس کی ہمیشہ خواہش رہتی ہے کہ وہ اپنی

زارا کی کہانی ایک سچا واقعہ ہے

نانی کے پاس رہے۔ گھر والوں میں اسے صرف ابّو اور چھوٹی بہن اچھے لگتے ہیں۔

زارا کی زندگی میں تبدیلی کا سلسلہ، اس وقت شروع ہوا، جب اس کی ماں نے اسے گھر گرہستی سکھانے کے لیے 'پریشان کرنا' شروع کر دیا تھا۔ زارا کی ماں، اسے گھر داری کے تمام کام اور سلیقہ شعاری کے ہنر سکھانا چاہتی تھی۔ زارا کو بہت صبح سویرے اٹھا دیا جاتا۔ وہ سکول جانے سے پہلے برتن دھوتی، آٹا گوندھتی، گھر کی صفائی کرتی اور پھر اپنے بھائیوں کے کپڑے استری کرتی۔ سکول سے آنے کے بعد سیپارہ پڑھنے، کپڑے دھونے، سلائی کڑھائی کا کام سیکھنے اور نہ جانے کتنے جنجالوں میں زارا کی ننھی سی جان پھنس گئی تھی۔ ان تمام کاموں کے علاوہ بڑے بھائیوں کی بدتمیزیاں اور خدمتیں اور پھر ذرا سی کوتاہی پر ماں کی مارپیٹ اور پھٹکاریں۔ زارا کی ماں کو کبھی کبھار خیال تو ضرور آتا کہ وہ ضرورت سے زیادہ، زارا پر بوجھ ڈال رہی ہے۔ مگر دل کو سمجھا لیتی کہ آخر تو اس میں زارا کا ہی فائدہ ہے۔ وہ اچھی سلیقہ شعار عورت بن جائے گی تو سسرال میں اس کی عزت ہوگی۔ ایک دن تو اسے شادی کر کے اپنے گھر جانا ہی ہوگا۔ ماں باپ کا گھر، پرایا گھر ہی تو ہے۔ آخر اس کے ساتھ بھی تو یہی کچھ ہوا تھا۔ یہی ریت ہے اور اسے ہر عورت کو نبھانا ہوتا ہے۔

زارا، اپنے محلے میں ہی ایک سکول میں پڑھتی ہے۔ پورا سکول چند کمروں پر مشتمل ہے۔ زارا جس کمرے میں بیٹھتی ہے، وہ انتہائی چھوٹا ہے اور اس میں چالیس کے قریب بچیاں بیٹھتی ہیں۔ کمرے میں ایک دروازے کے علاوہ کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں۔ گرمی کے دنوں میں کمرے میں اس قدر حبس ہو جاتا ہے کہ سانس لینا بھی مشکل ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ بچیوں کو اپنا جسم ڈھانپ کر رکھنا چاہیے۔ زارا، شروع شروع میں ماں سے بحث کرتی کہ اس کے بھائی اپنے جسم کیوں نہیں ڈھانپتے۔ بحث کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ زارا کو چادر اوڑھنا ہی پڑی۔ البتہ اس میں ایک احساس ضرور پیدا ہو گیا کہ اس کا جسم مردوں کے جسم کے مقابلے میں 'شرمناک' ہے۔

ابتدائی جماعتوں میں زارا کو پڑھانے والی ٹیچر بہت پیار کرنے والی تھی۔ وہ بچیوں کو کہانیاں سناتی۔ ان کے ساتھ طرح طرح کے کھیل کھیلتی۔ زارا کو یہ ٹیچر بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ اکثر اس کے لیے ایک پھول لے جاتی۔ ٹیچر، پھول لینے کے بعد زارا کو ڈھیر سارا پیار کرتی، اس کا ماتھا چومتی۔ زارا، ٹیچر

کی ٹانگوں کے ساتھ چمٹ جاتی اور بس خوش ہو جاتی۔ یہ ٹیچر دو سال پہلے سکول چھوڑ گئی۔ اس کی جگہ جو ٹیچر آئی، وہ نہایت غصے والی اور چڑچڑی سی تھی۔ اس کا کام سارا دن بچیوں کو مارنا اور پھٹکارنا ہی تھا۔ زارا کو اپنی پیاری ٹیچر کے چلے جانے کا دکھ تو تھا مگر کیا کرتی۔ بس چپ چاپ، دبکی سی بیٹھی رہتی۔ اسے کبھی مار یا دھتکار کا سامنا تو نہ کرنا پڑا تھا، البتہ دوسری بچیوں کے ساتھ جو کچھ ہوتا، اسے دیکھ کر سہمی سی بیٹھی رہتی۔

II

کچھ مہینے پہلے، زارا سوتے میں ڈر جاتی تھی۔ اسے خواب میں کالے کپڑوں والی بدشکل عورتیں نظر آتی تھیں۔ یہ عورتیں اس کے پیچھے بھاگتیں، اسے ڈراتیں اور پھر ان میں سے دو، اسے پکڑ لیتیں۔ ایک عورت اپنا گھناؤنا چہرہ، زارا کے منہ کے قریب کرتی تو زارا سخت ڈر جاتی۔ خوف اور بے بسی سے اس کے حلق سے عجیب سی بھاری آواز نکلنے لگتی—— اس کا سارا بدن بے جان سا ہو جاتا—— مگر وہ ہاتھ پاؤں مارتی، ان عورتوں کے ہاتھوں سے نکل بھاگتی اور بھاگتی جاتی۔ ایک گلی سے دوسری گلی اور پھر گرتی پڑتی ایک چوک میں جا پہنچتی۔ وہ تسلّی کرنے کے لیے کہ عورتیں اس کے پیچھے تو نہیں آ رہی ہیں، مڑ کر دیکھتی ہے تو وہی بھیانک چہرے والی عورت بدستور اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس عورت کا چہرہ، زارا کے چہرے کے بالکل قریب ہوتا ہے اور اس کا دھڑ اور ٹانگیں گلی کے موڑ تک پھیلے ہوتے ہیں۔ یہ دیکھ کر زارا کی چیخ نکل جاتی ہے۔ چیخ اگرچہ خواب میں نکلتی ہے مگر سچ مچ اس کے حلق سے بھی نکلتی ہے۔ اس کے گھر والے اسے سنتے ہیں اور اس کی طرف بھاگتے ہیں۔ اسے گود میں بٹھا لیتے ہیں۔ زارا بے سدھ اور پسینے میں بھیگی ہوتی ہے۔

پچھلے چند ہفتوں سے زارا کو خواب میں بھیانک عورتیں تو نظر نہیں آتیں، البتہ اب ان کی جگہ ایک سرکٹا بھوت دکھائی دینے لگا ہے۔ بھوت نے عورتوں جیسے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبا اور چمکدار چھرا ہوتا ہے۔ زارا، ایک کمرے میں بند ہے۔ کمرے سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ بھوت زارا کے پیچھے بھاگتا ہے۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے کمرے میں چکر لگاتی ہے۔

آخر تھک کر گر پڑتی ہے۔ وہ گرتی ہے تو بھوت اس پر چھرے کا وار کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ زارا مسلسل، پچھلی طرف پھسلتی، کونے میں جالگتی ہے۔ کونے میں سمٹتے ہی، زارا، اپنے آپ کو بھوت کے نرغے میں بے بس محسوس کرتی ہے۔ بھوت اس پر وار کرتا ہے۔ وہ خوف سے تلملا اٹھتی ہے۔ اس کی نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کے حلق سے ایک بھیانک آواز نکل رہی ہوتی ہے، جیسے اسے ذبح کیا جارہا ہو۔

زارا کے لیے، ان بھیانک خوابوں کا تجربہ اس قدر لرزہ خیز ہے کہ اگر وہ دِن میں بھی کوئی ایسی چیز دیکھ لے، جس کی نسبت (Association) کسی طور خواب میں نظر آنے والی کسی چیز سے ہو، تو وہ خوف کی گرفت میں آجاتی ہے، مثلاً کالا کپڑا یا چمکدار شے۔

III

کسی بھی فرد کے دِل ودماغ میں جس قسم کا احساس (Feeling) ہوگا، اسی قسم کا اظہار (Expression) اس کے رویّے میں جھلکے گا۔ یہ کیفیت مختصر وقت کے لیے بھی ہوسکتی ہے اور اگر یہی احساس زیادہ دیر تک قائم رہے تو اس سے شخصیت میں مستقل رویّے بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ کے دل ودماغ پر پیار سے متعلق احساس کا غلبہ ہے تو آپ کو اردگرد کے لوگ اور اشیا بھی اچھی لگیں گی۔ لفظوں اور تصوّرات کا چناؤ اسی پیار کے احساس سے پھوٹے گا۔ اس احساس کو ظاہر کرنے کے لیے مثال کے طور پر آپ کہیں گے: ''مجھے اپنے ہر طرف ایک خوشبو سی محسوس ہو رہی ہے۔'' یا یہ کہ ''—— پیاُر کے احساس سے پہلے دنیا ایسی خوبصورت نہ تھی•••'' وغیرہ وغیرہ۔ اگر یہ احساس مستقل بنیادوں پر آپ کے شعور کا حصہ بن جائے تو پھر آپ اپنے ہر کام میں دوسروں کا خیال رکھنے (Care) کو ہی اپنا اصل مقصد مان لیں گے۔ 'دوسروں' میں صرف انسان ہی نہیں، جانور اور فطرت بھی شامل ہوگی۔

زارا اب تک جس صورت حال میں پلی بڑھی، اس میں اس کے دل ودماغ میں جو غالب احساس پیدا ہوا اس کا اظہار کالے کپڑوں والی، ہولناک چہروں والی دو عورتوں اور سر کٹے بھوت کی صورت میں ہوا۔ دونوں عورتیں اور سر کٹا بھوت اس کی جان کے درپے ہیں۔ وہ ان دونوں کی موجودگی میں شدید

عدم تحفظ اور خوف محسوس کرتی ہے۔ دونوں اس کی کمزور جان کے مقابل، طاقتور ہیں۔ زارا ان عورتوں سے جان بچانے کی کوشش میں بھاگتی تو ضرور ہے مگر اس کی یہ کوشش بے فائدہ رہتی ہے۔ وہ مڑ کر دیکھتی ہے تو یہ اس کے سامنے ہوتی ہے۔ صرف اس کے سامنے ہی نہیں ہوتی، اس عورت کا جسم غیر معمولی طور پر بہت لمبا ہو جاتا ہے۔ زارا اس غیر معمولی جسامت کے سامنے اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتی ہے۔ یہی صورت حال سر کٹے بھوت کی ہے۔ سر کٹا بھوت، اسے ایسے کمرے میں مارنے کی کوشش کرتا ہے، جس سے فرار کی کوئی راہ ہی ممکن نہیں۔ یہ بے بسی کی انتہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ آخر وہ کون سے محرکات تھے، جن کی بدولت زارا کے دل ودماغ میں ایک ایسا احساس پیدا ہوگیا، جس کا اظہار دو ہولناک چہروں والی عورتوں اور پھر سر کٹے بھوت کی صورت میں ہوا۔۔۔؟

زارا کی ننھی سی، معصوم دنیا کو غیر محفوظ بلکہ ہولناک حد تک آسیب زدہ کرنے میں دو عورتوں کا کردار بنیادی ہے۔ ایک اس کی ماں اور دوسری اس کی ٹیچر۔ ان دونوں نے خوف اور عدم سلامتی والا جو ماحول زارا کے اردگرد پیدا کیا، اسی سے اس کے ذہن میں، ایک احساس کی تشکیل ہوئی۔ اس احساس کا اظہار شروع میں دو ہولناک عورتوں کی صورتوں میں ہوا۔ خوف اور عدم تحفظ کی اس صورت حال کے سامنے زارا بے قرار تو ضرور تھی مگر وہ اس سے بھاگنے کے لیے کوشش کر سکتی تھی۔ جب اس کے ذہن میں مکمل بے بسی اور اس کے سامنے ہار جانے کا احساس پیدا ہو گیا تو پھر سر کٹے بھوت کی صورت میں اس کا اظہار ہونے لگا۔ پہلے، دو عورتوں کے بھوت کی صورت میں، زارا اپنے آپ پر ہونے والے ظلم اور ظلم کرنے والے کی نشاندہی کر سکتی تھی۔ اس نشاندہی کے لیے عورتوں کے چہرے ہونا ضروری تھے۔ جب وہ اس صورت حال کے سامنے مکمل طور پر بے بس ہوگئی اور اس میں ظلم کرنے والے کے خلاف تگ ودو کی صلاحیت ختم ہوگئی تو سر کٹے بھوت کی صورت میں اس کا اظہار ہوا۔ چونکہ دفاع کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی، اس لیے ظلم کرنے والے کی نشاندہی بے معنی ہوگئی۔ ایسے میں ظلم اور ظلم کرنے والی کی تصویر سر کے بغیر بنی۔ شناخت کے لیے چہرہ لازمی ہوتا ہے۔ اگر شناخت کی ضرورت ہی نہ رہے تو صرف جسم ہی اس

خوف اور عدم سلامتی کے اظہار کا ذریعہ بن گیا، جس نے ہاتھ میں تلوار اٹھا رکھی تھی اور زارا کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

IV

زارا کی معصوم دنیا کو غیر محفوظ بلکہ ہولناک بنانے میں دو عورتوں کا رویّہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے ـــــ ایک ماں اور دوسری اس کی موجودہ ٹیچر۔ دونوں عورتیں ہیں اور ایک بچی کو اس سانچے (Format) میں ڈھالنے کی کوشش کر رہی ہیں جو روایت (Tradition) میں عورت کے لیے طے ہے۔ ماں، زارا کو ایک تابعدار بیوی اور ایک سگھڑ ماں بنانا چاہتی ہے جبکہ اس کی ٹیچر، سکول یا کمرۂ جماعت میں پیدا کردہ جبر (Suppression) اور خوف کے ماحول میں رہنے کی تربیت کر رہی ہے۔ واضح رہے کہ کمرۂ جماعت میں پیدا کردہ جبر اور خوف کا ماحول سیکھنے سکھانے کے لیے کارآمد ہو یا نہ ہو، بچوں کی جبر اور خوف سے پیدا ہونے والی گھٹن میں گزارہ کرنے کی تربیت ضرور کر دیتا ہے۔

زارا میں کسی بھی بچے کی طرح، ایک ہزار صلاحیتیں اور خوبیاں موجود ہیں۔ اگر ان کی بخوبی نشوونما ہو جائے تو وہ کسی بھی صنفی یا جنسی تفریق (Gender Discrimination) سے قطع نظر ایک خود مختار (Autonomous) ❶ فرد بن سکتی ہے۔ مگر اس میں موجود دیگر صلاحیتوں کو الگ کر کے صرف ان صلاحیتوں کی نشوونما کی کوشش کی جا رہی ہے، جن کی بدولت وہ صرف ایک تابعدار بیوی اور سگھڑ ماں

❶ عام طور پر خود مختاری کی جب بات کی جائے تو اس سے مراد معاشی خود مختاری ہی ہوتا ہے۔ حالانکہ اس بے اہم ذہنی خود مختاری ہے۔ ذہنی خود مختاری ہو تو کوئی بھی شخص بہت سی غیر ضروری معاشی بندشوں سے بھی آزاد ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی شخص جب ذہنی طور پر خود مختار ہو جائے تو کسی قسم کا خوف، عدم سلامتی، ترغیب (Temptation) یا روایت کا جبر اس پر اثر نہیں کر سکتا۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ خود مختار شخص ایک طرح سے خودسر اور بے لگام ہو جاتا ہے۔ ذہنی خود مختاری بہر طور انسانوں، فطری ماحول اور انسانی زندگی کے تسلسل (Historical Process of Human Life) سے منسلک رہتی ہے۔ ان تمام عوامل (Factors) کے ساتھ اس کا رشتہ ناقدانہ شعور (Critical Consciousness) پر استوار ہوتا ہے۔ ناقدانہ شعور کی بنیاد سوال کرنے اور مکالمہ کرنے پر ہے۔ سوال اور مکالمے کا عمل ہر صورت میں انسانوں سے پیوست رہتا ہے۔ اس عمل میں وہی بات، حتمی عمل (Praxis) کے لیے طے ہوگی جو سب انسانوں، فطری ماحول اور انسانی زندگی کے تسلسل کے لیے بہتر ہوگی۔

بن جائے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ ایک شخص کی دیگر تمام انسانی خصوصیات کو رد کر کے، صرف اس کی جسمانی محنت کو ہی اس کی واحد انسانی خصوصیت مان لیا جائے۔ اسے محنت پر مجبور کرنے کے لیے سدھا لیا جائے۔ سدھانے کے نتیجے میں وہ اپنے فیصلوں میں نہ صرف ذہنی طور پر بلکہ جسمانی طور پر بھی آزاد اور خود مختار نہ رہے۔ ذہنی طور پر مفلوج بنانے کے لیے اسے اذیتیں دی جائیں اور اسے روایتی خیالات کی زنجیروں میں قید کر دیا جائے۔

زارا کا معاملہ ہو یا کھیتوں میں کام کرنے والے غلام کا قصہ، دونوں صورتوں میں انسان کی فطری صلاحیتوں سے انکار کر کے صرف کارآمد خصوصیات کو ہی ان دونوں کی شناخت سمجھ لیا گیا۔ ایک زمیندار نے ایک غلام کو خریدا۔ اس لیے خریدا کہ وہ اس کے کھیتوں پر کام کرے۔ وہ اپنے غلام کو اس حد تک زندہ رکھے گا کہ اسے غلام کی مزدوری ملتی رہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ایک ماں کیونکر ایک معصوم بچی کی زندگی کو سگھڑ ماں یا تابعدار بیوی بنانے کے لیے ایسے ہتھکنڈے استعمال کر رہی ہے؟ بچی کا ذہنی سکون اور آسودگی سرے سے ختم ہو گئی ہے اور وہ ہولناک عدم سلامتی کا شکار بن گئی ہے۔ صدیوں سے چلتی، نسل در نسل منتقل ہونے والی روایت میں زارا کی ماں ایک کڑی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس نے سمجھ لیا ہے کہ وہ اس 'مقدس روایت' کو اسی طرح آگے زارا تک منتقل کر دے گی، جس طرح اس کی ماں نے اس روایت کو اس تک پہنچایا تھا۔ اسی طرح وہ اپنے 'ممتا کے فرض' سے سبکدوش ہو جائے گی۔ خواہ اس میں اس کے ہاتھوں کیسا ہی دردناک جرم سرزد ہو جائے۔

کیا ایسی روایت، جس میں انسانوں کی قربانی بغیر کسی تردّد کے، ایک فرض کے طور پر کر دی جائے، محبتوں والی محفوظ دنیا اور رشتے بنا سکتی ہے؟

2

انسانوں کو سدھانے کی روایت

کوئی بھی موجودہ صورت حال (Present Circumstances) ماضی کے تسلسل میں پیدا ہوتی ہے۔ آج کے انسان کی مجبوریاں، دقتیں اور مجموعی صورتحال اس وقت تک نہیں سمجھی جا سکتی جب تک اس صورت حال کے پیدا ہونے میں انسانی زندگی کے تسلسل کو نہ سمجھا جائے۔ زندگی کے ہر پہلو کو سمجھنے کے لیے، اس تسلسل سے مدد لی جا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے زندگی کا ہر پہلو اور خود انسان اپنے ہونے کے اعتبار سے تاریخی وجود رکھتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ انسان اور اس کی زندگی کو مجموعی انسانی تسلسل سے الگ کر کے سمجھا جا سکے۔

موجودہ صورتحال کو انسانی زندگی کے تسلسل میں سمجھنا، جابر اور مجبور دونوں کے لیے یکساں طور پر کارآمد ہو سکتا ہے۔ جابر، لوگوں کو اپنے اختیار میں رکھنے کے لیے، اختیار کی روایت اور اس میں چھپے کارآمد ہتھکنڈوں کو سیکھ سکتا ہے اور انسانی زندگی میں جاری جبر کو جاری رکھ سکتا ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ کس طرح ایک جابر کی حیثیت میں وہ انسانی حسیات سے عاری ہو کر غیر انسان بن گیا۔ دوسری طرف مجبور، اسی روایت میں ان گوشوں کی نشاندہی کر سکتا ہے، جن پر مجبوری کا نظام جاری رہا۔ وہ ان گوشوں کے پیچھے محرکات اور ان طریقوں کو سمجھ سکتا ہے جن کے باعث مجبوری کو برقرار رکھا گیا۔ ایسا کرتے ہوئے، وہ ان محرکات پر سوال اٹھائے گا، سوچ بچار کرے گا، نتائج نکالے گا اور پھر ساتھی مجبوروں کے ساتھ گفتگو کرے گا۔ مجبوری کی صورت حال کو تبدیل کرنے کے لیے نیا علم پیدا ہوگا۔ جب نیا علم پیدا ہوگا تو مجبوری کے ہتھکنڈوں کو بے اثر کرنے کا شعور بھی پیدا ہوگا۔ یہیں سے تبدیلی کا عمل شروع ہوگا۔

انسان میں پیدائشی طور پر چار بنیادی اور ناگزیر قوتیں ہوتی ہیں۔ یہی چار قوتیں، اس کی زندگی کا بنیادی محرک بنتی ہیں —— کھانا، دفاع، عدم سلامتی کی صورت میں خوف کا شکار ہوگا اور اس صورت حال سے فرار کی کوشش کرنا اور نسل انساں کو آگے بڑھانا۔

تاریخی اعتبار سے، انسان مختلف مراحل سے گزرا۔ پیٹ بھرنے کے لیے انسان نے پھل وغیرہ اکٹھا کرنے، شکار کرنے اور پھر وسائل پیداوار کی افزائش کے لیے کھیتی باڑی کرنا شروع کردی۔ انسان جس فطری ماحول میں پیدا ہوا، اس میں ہر کام اور عمل کسی طریقے یا قانون کے تحت ہوتا ہے۔ انھی طریقوں اور قوانین کو سمجھ کر، انسان نے پیداوار کے لیے ضروری، فطرت کے بھید کو سمجھا۔ اس عمل میں جیسے جیسے انسان آگے بڑھتا گیا، اس نے نہ صرف پیداواری وسائل کو بڑھایا بلکہ اس کا اپنے آپ پر بھروسہ بھی بڑھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس کا اپنی ذات کے بارے میں شعور بھی بدلا۔ (Marx K. 1961, P.139)

مجموعی طور پر اس عمل میں انسان نے نت نئی تخلیقات کیں۔ ان تخلیقات میں بنیادی محرک اس کی اپنی محنت (Labour) تھی۔ یعنی یہ کہ محنت کی بدولت ہی اس کے اردگرد فطرت نے پیداواری وسائل پیدا کرنے میں اس کی معاونت کی۔ چونکہ انسانی محنت سے تخلیق ممکن ہوئی، اس لیے انسان کا اپنی تخلیق کو دیکھ کر خوش ہونا ناگزیر نتیجہ تھا۔ اسے محنت کر کے خوشی اور لذت کا احساس ہوتا تھا۔

☆ اگلے صفحے پر انسانی تاریخ میں رونما ہونے والے اہم واقعات کا گوشوارہ دیا گیا ہے۔ اس گوشوارے کو اس ڈھنگ سے ترتیب دیا گیا ہے کہ انسانی زندگی کے تسلسل میں جابر اور مجبور کی تقسیم واضح ہو جائے۔ ان تضادات (Conflicts) کی وضاحت ہو جن کے باعث مجبوری کی روایت ٹھوس حقیقت کے طور پر استوار ہوئی۔

انسانی زندگی کا تسلسل

تقویم	زندگی میں اہم تبدیلیاں	عام لوگوں کی زندگی پر اثر
قدیم پتھر کا زمانہ (ایک لاکھ سے دس ہزار سال پہلے کا درمیانی عرصہ)	● لوگوں کا خوراک کے سلسلے میں مکمل انحصار فطرت میں پہلے سے اُگے پودوں، پھلوں اور بیجوں پر تھا۔ ● سب لوگ مل جل کر اپنی خوراک اکٹھی کرتے اور مل کر اپنا دفاع کرتے تھے۔ ● لوگ گروہوں کی شکل میں رہتے تھے اور انتظام کی ذمے داری مشترکہ تھی۔ ● اوزار بنانے کا کام بھی مل کر کیا جاتا تھا۔ ● حکمران تھا اور نہ ہی محنت کی بنیاد پر پیشوں کی تقسیم تھی۔ ● اجتماعی احساس اس قدر غالب تھا کہ خوراک ہوتی تو سب بانٹ کر کھالیتے ۔ اگر نہ ہوتی تو سب بھوکے رہتے۔	● انفرادی خودغرضی کی بجائے ہر کام میں مشترکہ مفادات کا خیال رکھا جاتا تھا۔ ● صنفی یا جنسی تفریق نہ تھی اور عورت ہر کام میں برابر کی شریک تھی۔
جدید پتھر کا زمانہ (دس ہزار سال قبل سے چھے ہزار سال کا درمیانی زمانہ)	● انسانی آبادیاں چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہنے لگیں۔ ● محدود پیمانے پر کاشت کاری ہونے لگی۔ ● لڑائی اور شکار کے لیے ہتھیار کثرت سے بننے لگے۔ ● لوگوں کی محنت اور محنت سے حاصل پیداوار پر قبضہ کرنے کے لیے طاقت کا استعمال شروع ہو گیا۔	● انسانیت دو گروہوں ، طاقتوروں اور محتاجوں کی صورت میں تقسیم ہوگئی۔ ● انفرادی وقار کا معیار طے ہوا۔ اس وقار کی بنیاد طاقت پر تو تھی مگر اس شخص کو معزز سمجھا جاتا تھا جو دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرے۔ ● عورت پر مرد کی حاکمیت نہ تھی۔

تقویم	زندگی میں اہم تبدیلیاں	عام لوگوں کی زندگی پر اثر
	● فیصلے کرنے میں ،طاقتور کا کردار فیصلہ کن ہوگیا۔ اس طرح محنت کرنے والی اکثریت اور طاقتور لوگوں کی اقلیت واضح نظر آنے لگی۔ ● خیرات کا تصوّر پیدا ہوا۔ قحط، لڑائی یا مصیبت کے وقت طاقتور اپنے گودام سے اناج، ہتھیار اور ضروری مدد فراہم کرتا تھا۔ ● دوسروں کی پیداوار حاصل کرنے کے لیے جنگ کا بطور ہتھیار استعمال۔ ● جانوروں کو بار برداری ، کاشت کاری اور خوراک کے لیے سدھانا۔	
تہذیبوں اور ریاست کا قیام (چھے ہزار ق م سے 300 ق م کا درمیانی عرصہ)	● آبپاشی کے لیے بند بنانا۔ ● غلے کو محفوظ رکھنے کے لیے گودام بنانا۔ ● غلہ گوداموں کا منتظم، معاشرے میں سب سے طاقتور فرد کے طور پر ابھرا۔ ● غلہ گوداموں کو سب سے پہلے مذہبی مقام اور اس کے منتظم کو پہلے مذہبی رہنما کا درجہ حاصل ہوگیا۔ ● پیداوار جو عوام کی اکثریت ، اپنی محنت سے پیدا کرتی تھی، اس کا نصف حصہ حکمران اور مذہبی رہنماؤں نے ہتھیانا شروع کر دیا۔	● محنت کی بنیاد پر لوگوں کی اکثریت کو مختلف پیشوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ● آبادی واضح طور پر عوام اور خواص میں تقسیم ہوگئی۔ ● سماجی اور پیداواری وجوہات کی بنیاد پر مرد اور عورت میں صنفی یا جنسی تفریق قائم کر دی گئی۔ ● آبادی کا اکثریتی حصہ حکومتی اقلیت کا غلام بن گیا۔ ● قحط کی صورت میں عام لوگوں کے لیے ایک صورت یہ تھی کہ وہ فاقوں سے مر جائیں یا پھر نہایت کم اور معمولی کھانے پر زمین پر کام کرتے رہیں۔

	● طاقتور گروہ نے حکمرانی کے اصول وضع کر کے عوام کو تحکمانہ نظام میں رہنے پر مجبور کردیا۔ مذہبی گروہ نے اس کا جواز دینا شروع کر دیا اور اس طرح حکمرانی کی ضروریات کے تحت مذہب پر مبنی شعوری نظام قائم ہوگیا۔ ● جنگوں کے جواز کے لیے مذہبی، نظریاتی اور قانونی حیلہ سازیاں شروع ہوگئیں۔ ● طاقت کی بنیاد پر اقتدار کی روایت مضبوط ہوگئی۔ ● پیداوار اور دولت کا زیادہ سے زیادہ ارتکاز طاقتوروں کے پاس ہوگیا۔ وہ اپنی طاقت کی حفاظت کے لیے شان وشوکت اور دبدبے کی زندگی گزارنے لگے۔ وسائل سامانِ عشرت اور تحکم کو برقرار رکھنے پر خرچ ہونے لگے۔ دوسری طرف عوام محدود پیداواری عمل میں الجھ کررہ گئے۔ ایسی صورتحال میں فطرت کو سمجھنے اور اسے اپنے وسائل بڑھانے کے لیے استعمال کرنے کا عمل رک گیا۔ ● دیہات میں خودکفیل معیشت کا قیام۔ ● شہر وجود میں آئے۔ دیہات میں پیدا ہونے والے وسائل نجی ضرورت کے علاوہ منڈی میں فروخت کے لیے بڑھائے جانے لگے۔ ● فالتو دولت پیدا ہونے لگی۔	● عام لوگوں کو سدھانے کے لیے انھیں وسیع تر معاشی، معاشرتی اور مذہبی نظام میں قید کردیا گیا۔ ● عام لوگ کم سے کم وسائل پر گزارہ کرنے پر مجبور ہوگئے۔ ● ایسا سیاسی نظام پیدا ہوگیا جس کے تحت غریبوں اور عام لوگوں کے تحفظ کا ذمہ طاقتور گروہوں کے پاس چلا گیا۔ عام لوگوں کے حقوق کا دفاع اور اس کا دعویٰ تو ہونے لگا مگر عوام کو اپنی زندگیاں بدلنے کا اختیار اور اس سے متعلق حقوق نہ دیے گئے۔

سرمایہ دارانہ نظام (سترھویں صدی سے تا حال)	● زرعی نظام کی تجارتی بنیادوں پر تنظیمِ نو۔ صنعتی کارخانوں کا قیام۔ ● انسانی جسم کی طاقت کی بجائے سائنسی ایجادات اور ٹیکنالوجی کی مدد سے مشینوں کو چلانے کا رواج ہوا۔ ● قومی منڈیوں کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی تجارت اور سرمائے کی افزائش۔ ● بڑے بڑے تاجروں اور سرمایہ کاروں کے گروہ پیدا ہونے لگے۔ ● ایسے نظریات کی ترویج ہونے لگی جو زرعی نظامِ معیشت کے برعکس سرمایہ دارانہ افزائش کے لیے موزوں تھے۔ ● سائنسی تحقیق سرمائے کی افزائش کے لیے بنیادی محرک بن گئی۔ ● سرمایہ دارانہ نظام کے تحفظ کے لیے عام لوگوں کو سدھانے اور مجموعی کنٹرول کے لیے نئے معاشرتی نظام پیدا ہونے لگے۔ ان میں سب سے اہم سرمایہ دارانہ جمہوریت کا قیام تھا۔ ● سرمایہ دارانہ جمہوریت میں قانون سازی، انتظامیہ اور عدالتی نظام کو مرکزی حیثیت دے دی گئی اور ان سب اداروں پر حتمی اختیار اس گروہ کے پاس چلا گیا جو وسیع تر معاشی کنٹرول رکھتا تھا۔	● زرعی مزدور اور کسان ایک مجبوری سے نکل کر دوسری مجبوری میں آپھنسے۔ صنعتی ترقی کے لیے ان کو شہروں میں آنا پڑا جہاں انھیں سخت برے حالات میں 12-16 گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ ● سدھانے کے نئے معیار مثلاً فرض شناسی، پابندی میں رہنا، مالک سے وفاداری اور کام ملنے یا نہ ملنے کے خوف کو فروغ ملنے لگا۔ ● تعلیمی نظام میں سدھانے کا عنصر غالب ہوگیا۔ اس کا مقصد اب موجودہ نظام کے لیے وفادار کارکن پیدا کرنا تھا۔ ● مجموعی طور پر سدھانے کی ضروریات کے تحت خاندان کی نئے سرے سے تنظیم ہوئی۔ سماجی جبر، اس تنظیم کا بنیادی تقاضا ٹھہرا۔

	● ایسے جعلی نظریات کو فروغ دیا گیا، جن کے باعث عوام کو احساس دلایا گیا کہ وہ بھی ریاستی معاملات میں برابر کے حصے دار ہیں۔ ان نظریات میں سب سے کارگر قوم پرستی کا نظریہ تھا۔ اسی کے تحت ہولناک جنگیں ہوئیں اور اکثریتی عوام کروڑوں کی تعداد میں مارے گئے۔ یہ جنگیں دراصل ان سرمایہ کاروں کے ایماء پر ہوئیں جو زیادہ سے زیادہ وسائل کو اپنی دسترس میں رکھنا چاہتے تھے۔ ● ایشیا ، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں موجود قدرتی اور انسانی وسائل پر قبضے کی غرض سے نو آبادیاتی نظام بنائے گئے۔ ان کا بظاہر مقصد ان علاقوں کے لوگوں کو مہذب بنانا تھا جب کہ اصل مقصد سرمایہ داری کی افزائش تھا۔ ● سرمائے کا ارتکاز دنیا کے چند سو افراد کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ ● زندگی گزارنے کا واحد مقصد چیزوں کو استعمال کرنا ٹھہر گیا، تاکہ زیادہ سے زیادہ چیزیں استعمال ہوں اور سرمائے کی حرکت اور اس سے ملنے والا منافع زیادہ تیزی سے بڑھے۔ ● چیزوں کے زیادہ سے زیادہ استعمال کی بنیاد پر نیا سیاسی، معاشرتی اور معاشی نظام ظہور میں آ گیا۔	● نوآبادیات میں کروڑوں انسان غلام بن گئے۔ انھیں مقامی پیداوار کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی بھیجا جانے لگا۔ ● فرد ہونے کا معیار صرف اور صرف چیزوں کے استعمال پر ٹھہرا۔ ● بنیادی سماجی محرک صرف یہ ہے کہ 'استعمال کرو اور خود استعمال ہونے کے لیے تیار رہو۔۔۔'

Source: A People's History of the World by Herman

محنت کے اس عمل میں صرف کھانے پینے کی اشیا ہی پیدا نہ ہوئیں ــــــ سادہ اور پھر پیچیدہ آلات کی ایجادات بھی ہوئیں۔ کھیتی باڑی کرنے کے لیے ایک جگہ پر رہنا ضروری تھا۔ اس طرح جب ایک جگہ پر بہت سے لوگ بس گئے تو ان کے آپسی تعلقات اور رہن سہن کے انتظامات کے ناطے فکری اور سماجی ادارے پیدا ہوئے۔ انسان کو ایسے رشتوں کے درمیان رہنے سے جسمانی اور ذہنی تحفظ ملا۔

کھیتی باڑی کا سلسلہ شروع ہوا تو انسانی بستیوں کی ایک ابتدائی صورت پیدا ہوئی۔ انسانی ضروریات کی فراہمی کے لیے محنت کی تقسیم (Division of Labour) بلحاظ ضرورت کرنے کی گنجائش پیدا ہوئی۔ اس سے پیشوں کی تقسیم شروع ہوگئی۔ کچھ لوگ براہ راست کھیتی باڑی سے منسلک ہو گئے۔ کچھ لوگ کھیتی باڑی کے لیے ضروری اوزار اور خدمات مہیا کرنے لگے۔ جب فصل تیار ہو جاتی تو ان پیشوں سے منسلک لوگوں کو بھی ان کا حصہ مل جاتا۔ اس لحاظ سے یہ سب لوگ کسان کے پیدا کردہ اناج کے محتاج تھے۔

آہستہ آہستہ جب پیداوار بڑھنے لگی تو ایسے پیشے بھی پیدا ہونے لگے جو براہ راست پیداواری عمل میں اوزاروں کی فراہمی یا محنت تو نہیں کرتے تھے البتہ وہ کسان یا دیگر پیداواری پیشہ وروں کی زندگی کے دیگر پہلوؤں سے ضرور متعلق تھے۔ جیسا کہ اناج اور مال ڈنگر کی حفاظت کے لیے چوکیدار، گاؤں میں آگ کی مسلسل فراہمی کے لیے فقیر۔ بعد میں جب مختلف دیہات اور شہروں کے درمیان مال کے تبادلے پر تجارت ہونے لگی تو دلال یا بچولیے (Middle Man) کا پیشہ پیدا ہو گیا۔

مذکورہ بالا پیشوں کے علاوہ سب سے اہم پیشہ حفاظت سے متعلق تھا۔ اس پیشے کا بنیادی مقصد دیہات میں تحفظ اور امن وامان کو یقینی بنانا تھا۔ اس سلسلے میں مشترکہ مفادات کے تحت سماجی حدود طے کر دی گئیں۔ ان حدود کے نفاذ کے لیے ایک طریقہ باہمی مشاورت کا تھا اور اس طرح لوگ بھائی چارے کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ منسلک رہ سکتے تھے۔ مگر اسی پس منظر میں ایک ایسا گروہ جو طاقت پر یقین رکھتا تھا بھی پیدا ہوا۔ یہ گروہ بھائی چارے کی بجائے صرف اور صرف لوگوں کو اپنے تسلط میں رکھ کر انھیں اور ان کی پیدا کردہ اجناس کو اپنی دسترس میں رکھنا چاہتا تھا۔ اس طرح انسانیت

اپنے بہت ابتدائی دِنوں میں ہی دو حصوں میں بٹ گئی۔

II

انسانیت کی تقسیم محض پیشوں کی تقسیم ہی نہ تھی، اس سے دو طرح کے مزاج پیدا ہوئے۔

پیداواری عمل اور اس سے منسلک لوگوں کو اپنی دسترس میں رکھنے والا گروہ اپنے مزاج کے اعتبار سے غیر سماجی تھا۔ وہ لوگوں میں بسا تو ضرور تھا مگر اپنے کسبوں کے حساب سے وہ کسی طور انسانوں میں بسنے کی صلاحیتیں نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی اس کی ایسی خواہش تھی۔

جب تک انسان نے کھیتی باڑی کرنا نہیں سیکھا تھا، وہ شکار کر کے پیٹ پالتا تھا۔ شکار کرنے کے لیے انسان میں موجود حملہ کرنے کی جبلّت نے اس کی مدد کی۔ اگر یہ جبلّت نہ ہوتی تو زندگی مشکل ہوجاتی ۔ یہ جبلّت آج بھی انسانوں میں موجود ہے اور اس کا بنیادی کردار خود حفاظتی (Self-defence) سے منسلک ہے۔ حملہ صرف جسمانی ہی نہیں، الفاظ اور رویّوں سے بھی ممکن ہے اور یہ لامحالہ اسی حملہ کرنے والی جبلّت کا حصہ ہیں۔ پیداواری عمل اور اس سے منسلک پیشہ وروں پر اپنا تسلّط قائم کرنے والا گروہ بنیادی طور پر جارحیت کر رہا تھا۔ اسے مکمل یقین تھا کہ وہ ایسا کام کر رہا ہے، جو نہ صرف درست نہیں بلکہ اس پر ردِّعمل بھی ہوسکتا ہے۔ اس گروہ نے اسی خوف اور خلش کے تحت حملہ کرنے والی جبلّت کی بنیاد پر ایک وسیع تر نظام قائم کیا۔ اس نظام کی اہم خصوصیات میں وہ تمام حربے شامل ہوگئے جو شکار کرنے کے لیے ضروری تھے۔ مثال کے طور پر چالبازی، مکّاری، مہم جوئی، مہم جوئی کے جوش وخروش سے لذّت اٹھانا، کامیابی کی صورت میں انانیت پرستانہ غرور، دوسروں میں خوف اور ہیبت پیدا کرنا، مہم جوئیوں کے دائروں کو وسعت دینا، مہم جوئیوں کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں کو بے دردی سے ختم کرنا وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام کارروائیوں میں بالخصوص انانیت پرستانہ غرور یا دوسروں میں خوف اور ہیبت پیدا کرنا یا مہم جوئی کرنا، دراصل اس احساس عدم تحفظ کی نشاندہی کرتے ہیں، جس کو ختم کرنے کے لیے یہ سب کچھ کرنا لازم سمجھا جاتا ہے۔ جو شخص اپنی ذات میں محفوظ ہونے کا احساس رکھتا ہو، اسے دوسروں میں خوف پیدا کرنے یا مہم جوئی کی حاجت نہیں رہتی۔

دوسری جانب پیداواری عمل سے منسلک تمام پیشوں کا تعلق بنیادی طور پر تخلیق اور فطرت سے وابستگی سے تھا۔ اس تعلق کی بنیاد پر جو مزاج پیدا ہوا، اس میں تخلیق کرنے کا لطف اور خوشی تھی۔ غرور یا تکبر کی بجائے کسان کے مزاج میں فطرت سے نیازمندی اور تشکّر کا احساس پیدا ہوا۔

ان تمام خصوصیات کے ساتھ ساتھ ایک کسان کچھ معاملات میں فطرت کے سامنے اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا تھا۔ مثال کے طور پر اس نے زمین کھودی، اس میں بیج ڈالا۔ اگر پانی میسّر تھا تو پانی ڈالا یا پھر بارش کا انتظار کرنے لگا۔ بیج کے اُگنے سے لے کر فصل کے تیار ہونے تک وہ فطرت کے سامنے بے بس رہتا تھا۔ فطرت کے سامنے بے اختیاری کے واضح احساس کے تناظر میں اگر حسبِ ضرورت بارش ہوجاتی اور فصل پک جاتی تو فطرت کے تئیں نیازمندی کا وسیع احساس پیدا ہونا یقینی تھا۔ اسی وسیع تر نیازمندی کے احساس کو استعمال کرنے والا ایک اور پیشہ پیدا ہوگیا۔ ان پیشہ وروں نے کسان کو سمجھایا بلکہ یقین دلایا کہ اس کی فطرت سے نیازمندی اپنی جگہ پر ٹھیک تو ہے مگر فطرت کے کھیتی باڑی سے متعلقہ شعبوں مثلاً بادلوں، زرخیزی اور موزوں حالات کو پیداوار بڑھانے کے لیے مائل رکھنے کے لیے انھیں خوش رکھنا ضروری ہے۔ خوش رکھنے کے لیے نذرانے دینے چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا نیازمندی سے متعلق پیشہ وروں نے سمجھایا اور نذرانے بھی انھی پیشہ وروں کو ملتے تھے۔ لیکن یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ کسان کے دیے ہوئے نذرانے، فطرت کو پہنچ گئے، مخصوص رسوم ادا کرنے لگے۔ اس طرح نیازمندی کے احساس کی بدولت متعلقہ پیشہ وروں کے روزگار کا ایک مستقل وسیلہ نکل آیا۔ دوسری جانب کسان کا احساسِ نیازمندی، اب انفرادی سطح سے اٹھ کر ایک وسیع ادارے کی صورت قائم ہوگیا۔ پہلے کسان فطرت کا محتاج تھا، اب ان پیشہ وروں کا بھی محتاج بن گیا جو نذرانے لے کر، رسوم ادا کر کے فطرت کی 'مہربانیوں' کو پیداوار کے لیے 'مائل' کرتے تھے۔ اس طرح کسان فطرت اور اس سے نیازمندی کے لیے ان پیشہ وروں کے سامنے مکمل طور پر بے بس ہوگیا۔ جب کسی شخص کی کسی چیز یا ہستی کے ساتھ نیازمندی ہو مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کی مہربانیوں کے لیے محتاج (Dependent) بھی ہو جائے تو ایسے میں ان دونوں (چیز اور ہستی) کے سامنے اس کی بے اختیاری اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ ان پر آپ سوال نہیں اٹھا سکتے۔ سوال اٹھاتے ہی نیازمندی اور

مہربانیوں کی توقع دونوں ہی غائب ہوجاتے ہیں۔ نیازمندی ہوگی تو اس سے متعلق یا منسوب ہستی یا چیز ایک دائرے میں محفوظ ہو جائیں گے۔ اس دائرے کے اندر کسی قسم کا اعتراض یا سوال نہیں پہنچ سکے گا۔ ایسی چیزوں یا ہستیوں کو مقدّس ہونے (Sacred) کا نام دیا گیا۔ جو باتیں اس مقدس دائرے اور ہستی/چیز سے منسوب ہو جائیں گی، وہ باتیں بھی مقدّس باتیں سمجھی جائیں گی۔ چونکہ مقدس باتوں، ہستیوں یا چیزوں پر سوال اٹھانے سے ان کی تقدیس والی حیثیت برقرار نہیں رہ سکتی، اس لیے ان کو بعینہٖ درست مان لیا جاتا ہے، یعنی ان پر یقین کرلیا جاتا ہے۔ اس طرح کسان کی فطرت سے نیازمندی سے ایک معاملہ شروع ہوا اور آخرکار اس کے نتیجے میں تقدیس پیدا کرنے والا ایک گروہ پیدا ہو گیا۔

تقدیس پیدا کرنے والے گروہ نے جب پیشہ ورانہ صورت اختیار کرلی تو تقدیس پیدا کرنے کا پھیلاؤ وسیع تر خیالات کی صورت میں زندگی کے ہر معاملے پر اپنا تسلّط پھیلانے لگا۔ تقدیس کا تسلّط بڑھنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کا اپنی زندگی کے معاملات پر اختیار اور سوال اٹھا کر ان کو بدلنے کی صلاحیت نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ تقدیس کا معاملہ چونکہ کلی طور پر یقین کرنے سے منسلک تھا، اس لیے اختیار اور سوال اٹھانے کی اس میں کوئی گنجائش نہ رہی۔

اس صورت حال میں لوگوں کو استعمال کرنے اور ان کے بارے میں سوچنے کا اختیار بھی تقدیس پیدا کرنے والے گروہ کے پاس چلا گیا۔ تقدیس پیدا کرنے والے گروہ کا لوگوں کے ذہنوں پر اس قدر کنٹرول تھا کہ ماننے والے ان کے کہنے پر اپنے عزیزوں اور معصوم بچوں کو بھی اپنے ہاتھوں سے ذبح کرنے سے نہ چُوکتے تھے۔

III

تقدیس پیدا کرنے والے گروہ اور پیداوار کو زبردستی ہتھیانے والے دونوں ہی گروہ، دراصل پیداوار کے عمل میں کچھ نہ کرتے تھے۔ دونوں کسان کے پیدا کردہ اناج کو ہڑپنا چاہتے تھے۔ اس لحاظ سے دونوں کے درمیان تعلق ناگزیر تھا۔ طاقت کا استعمال کر کے قبضہ کرنے والے گروہ نے اپنی دہشت گردی اور مار دھاڑ سے جب ایک علاقے میں اپنا تسلط قائم کرلیا تو تقدیس پیدا کرنے والے گروہ نے

اس گروہ کی تمام کارستانیوں کو مقدس جواز فراہم کردیا۔ اس گروہ میں شامل لوگوں کو مقدّس ہستیاں اور ان کے کاموں کو مقدّس فعل قرار دے کر لوگوں کے سوالات کو ممنوع قرار دے دیا۔ یہی وہ موقع تھا جب ریاست قائم ہوئی۔ ریاست کے حکمران، راجا اور بادشاہ بنے۔ پوری انسانیت دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ چند لوگوں پر مشتمل تھا اور دوسرا اکثریتی آبادی پر مشتمل تھا۔ تقدیس پیدا کرنے والے لوگ اور حکمران اکٹھے ہو گئے۔ بڑے گروہ میں پیداوار کے لیے محنت کرنے والے لوگ شامل تھے۔

انسانیت کی تقسیم سے صرف یہی نہیں کہ چھوٹے گروہ نے بڑے گروہ کی پیدا کردہ دولت اور پیداوار پر قبضہ کرلیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تقدیس کا ایک وسیع تر نظام بھی قائم کرلیا۔ اس نظام میں بڑے گروہ میں شامل ہر فرد کی محنت کرنے کی صلاحیت کو واحد انسانی وصف قرار دے دیا گیا۔ اس وصف کو تو استعمال کیا گیا مگر دیگر انسانی اوصاف مثلاً سوال کرنے اور خوداختیاری پر مبنی مزاج کی گنجائش ختم کردی گئی۔ تقدیس کا معاملہ جو اپنی ابتدائی صورت میں نیازمندی اور محتاجی پر مبنی تھا، ایک وسیع نظام کی صورت میں ڈھلا اور اس میں احساس گناہ، خوف، جبریت، سزا اور ہیبت جیسے عناصر شامل کر دیے گئے۔ یہ تمام عناصر ریاست پر قابض چھوٹا گروہ پھیلاتا تھا اور بڑا گروہ ان عناصر کے اندر رہ کر 'زندگی گزارنے کے آداب' سیکھتا تھا۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو وسیع تر ماحول میں طاقت کا استعمال ہی بنیادی محرک تھا اور اسی کے تحت تمام تر رشتے اور ادارے قائم ہوئے۔ جس طرح زمین پر گوشت پوست والے انسان طاقت پر استوار ماحول میں رہنے لگے، بعینہٖ اسی طرح کا ایک نظام آسمانوں پر بھی قائم کر دیا گیا جو زمینی نظام کا ہو بہو عکس تھا۔ (Marx K.)

تقدیس کے عمل کے ابتدائی دنوں میں نظامِ فطرت کے مختلف عناصر کو ضرورت کے حساب سے حیثیت (Importance) دی گئی۔ حیثیت دینے میں فائدہ اور نقصان دونوں کا عمل دخل بنیادی تھا۔ اس حیثیت کو دیوتا، دیوی، بھوت، چڑیل اور اس طرح کے ملتے جلتے نام دیے گئے۔

ابتدا میں تقدیس پیدا کرنے والے گروہ نے دیہات یا محدود علاقے کی سطح پر ضرورتوں کے تحت تقدیس کا نظام قائم کیا۔ جب وسیع علاقوں پر ریاست قائم ہوگئی تو ریاستی معاملات میں وحدت اور تنظیم

لانے کے لیے ریاست کا واحد حکمران، بادشاہ بن گیا جو تمام اختیارات کا مالک/وسیلہ بن گیا۔ اس دور میں کوئی بھی فرد، چونکہ اپنی خود اختیاری، تقدیس کے نظام کو سونپ چکا تھا، تقدیس قائم کرنے والے گروہ نے بادشاہ کے اقتدار کو جواز (Legitimacy) فراہم کر دیا کہ دراصل آسمانوں پر بیٹھی مقدس ہستیوں نے ہی اس کو بادشاہت کا اختیار دیا تھا۔ چونکہ اس جواز پر سوال اٹھانے کی سکت ہی نہ تھی، لوگوں نے اس پر یقین کر لیا۔

جب ریاستیں قائم ہوئیں تو اس وقت وسائل پیداوار، پیداواری طریقے اور ٹیکنالوجی بہت سادہ تھیں۔ اناج وغیرہ کی پیداوار فی ایکٹر کے حساب سے بہت کم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وسائل کو بڑھانے کے لیے بادشاہ اپنی سلطنت کو زیادہ سے زیادہ وسیع علاقے پر پھیلانے کی کوشش کرتے۔ اسی کوشش کے باعث، تمام بادشاہوں کا عمومی وطیرہ چونکہ لڑائی کر کے دوسرے بادشاہوں کے علاقوں پر قبضہ کرنا تھا، اس لیے ہر بادشاہ اپنی انفرادی حیثیت میں اپنے آپ کو غیر محفوظ تصوّر کرنے لگا۔ اسی عدم تحفظ کو ختم کرنے کے لیے بڑے سے بڑے اور مؤثر جنگی حیثیت رکھنے والے لشکر تیار کیے جانے لگے۔ لشکروں کے لیے اسلحہ و دیگر سامان کی فراہمی بلکہ عمومی انتظام اور مالیہ وغیرہ وصول کرنے کا کام بادشاہ کے حلیف سرداروں کے سپرد ہوتا تھا۔ چونکہ بادشاہ کی سلطنت کا اس کے ہاتھ میں رہنے کا انحصار انھی سرداروں کے ہاتھ میں تھا، اس لیے بادشاہ ہمیشہ ایک عدم تحفظ کی فضا میں زندگی گزارتا۔ اسی عدم تحفظ کو دور کرنے کے لیے وہ اپنی شان بان، رعب، دبدبے اور خوف کو مختلف طریقوں سے سرداروں اور عام لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ یہ سب عناصر مل کر بادشاہ کی ذات اور اس کے عہدے کے ارد گرد تقدیس کا ہالہ بناتے تھے۔ انھی کی بدولت وہ اپنی حاکمیت (Authority) برقرار رکھ پاتا تھا۔

ہمارے علاقے میں بادشاہت کی بنیاد، زرعی نظام پر تھی۔ زرعی معیشت سے حاصل ہونے والی آمدنی پر بادشاہ کی حکومت اور دیگر سامانِ شاہی کا انحصار تھا۔ اس طرح بادشاہت کے قیام اور استحکام کے لیے، ان دونوں سے مطابقت رکھنے والا معاشی نظام بنا۔ اسی نظام کی مناسبت سے لوگوں کی

کارکردگی کو ایک کارآمد سانچے میں ڈھالنے کے لیے ایک شعوری نظام (System of Consciousness) بنا۔ اسی شعوری نظام میں کچھ ہستیاں اور کچھ رویے مقدس سمجھ لیے گئے اور ان پر کسی قسم کا سوال اٹھانے کی کوئی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ واضح رہے کہ بادشاہی نظام کو برقرار رکھنے کے لیے انھی ہستیوں اور رویّوں کی بنیادی ضرورت تھی۔

مقدس ہستیوں/چیزوں میں سب سے اوپر، بادشاہ، جاگیردار یا علاقے کا سردار، برادری/کنبے کا سربراہ اور زمین وغیرہ تھے۔ بادشاہ، جاگیردار اور کنبے کا سردار دراصل طاقت کی وہ زنجیر بناتے تھے جو نہ صرف سیاسی بلکہ معاشرتی طور پر ریاست کے وسیع تر پھیلاؤ سے لے کر معاشرے کے سب سے چھوٹے مگر مرکزی ادارے (Basic Institution) کنبے تک، کو جکڑ لیتی تھی۔ ان تینوں ہستیوں کو مقدس قرار دے کر ان کی فرمانبرداری کو لازمی فرض کا درجہ دے دیا گیا۔

انفرادیت یا انفرادی اختیار کی گنجائش سرے سے ختم کرنے کے لیے فرد کو برادری کے طے کردہ اصولوں کے تابع کر دیا گیا۔ برادری، فرد کو اپنے اصولوں اور روایات کا اس قدر پابند کر دیتی تھی کہ وہ انفرادی اختیار کی چھوٹی سے چھوٹی کوشش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ فرد کو پابند کرنے کا یہ معاملہ اس قدر مؤثر تھا کہ برادری کی روایات خواہ وہ جس قدر بھی غیر انسانی ہوں، فرد کے لیے ایک ضمیر (Conscience) کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ایسے میں روایات کی پاسداری ایک فرد کے ضمیر کا مقدّس حصّہ بن جاتی تھی اور ان کو نبھانے کا مطلب ایک مقدّس فرض ادا کرنے سے کم نہ ہوتا تھا۔

چونکہ وسائل پیداوار کا تعلق زراعت سے تھا اور زراعت، زمین کے بغیر ممکن نہ تھی، اس لیے زمین کو مقدس حیثیت دے کر، اس سے جڑے رہنے کو اہم سماجی فرض قرار دے دیا گیا۔

ہستیوں اور چیزوں کی تقدیس کے ساتھ ساتھ کچھ رویّوں کو کسی بھی فرد یا گروہ کے لیے بڑائی کا بنیادی پیمانہ قرار دے دیا گیا۔ یہ سارے رویّے اپنے جوہر (Essence) کے اعتبار سے طاقت اور تحکّم کا عنصر رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر محنت یا ہاتھ سے کام کرنے والے کو ادنیٰ قرار دے دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو لوگ کچھ کام کیے بغیر، دوسروں کی محنت کی کمائی پر پلیں، وہ معزز ہیں۔ لوٹی ہوئی

دولت سے کسی ضرورت مند کی مدد کرنا خیرات کے زمرے میں آتا تھا۔ خیرات دینے کے عمل کے پیچھے ،دوسرے کی مدد کرنے سے زیادہ خیرات دینے والے کی اعلیٰ حیثیت کو ثابت کرنا، مرکزی بات بنتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر غریبوں کو ان کے حصے کی کمائی مل جائے تو خیرات دینے کی ضرورت ہی پیدا نہ ہو۔ واضح رہے کہ خیرات دینے والا، اگر اپنے آپ کو محنت کرنے والے لوگوں کا لازمی حصہ محسوس کرے تو وہ نہ تو محنت کو ادنیٰ کام تصوّر کرے گا، نہ ہی بغیر محنت کیے دوسروں کی کمائی کو لوٹے گا۔ پھر سخاوت کی بجائے باہم بانٹنے اور مل کر کھانے اور ایک دوسرے کا خیال کرنے (Care) والے رویے پیدا ہوں گے۔

بادشاہوں کے دور میں انسانوں کے باہمی تعلق کی بنیاد چونکہ طاقت اور ایک دوسرے کو ادنیٰ یا اعلیٰ ثابت کرنے پر ہوتی تھی، تعلقات میں خودمختاری اور آزادی کا عنصر غائب تھا۔ بیوی، خاوند کے اختیار میں تھی، بچے، باپ کے اختیار میں، کسان، زمیندار کے اختیار میں اور پورا ملک بادشاہ کے اختیار میں۔ ان تعلقات میں انفرادی پسند، ناپسند کا کوئی دخل نہ تھا۔ تعلق مجبوری پر مبنی تھا۔ اس تعلق کو نبھانے کے لیے وفاداری (Loyalty) کے رویے کو مقدس قرار دے دیا گیا۔ عورت، ساری زندگی ذلیل ہوتی تھی مگر وفاداری ثابت کرنے کے لیے مرد کا گھر نہیں چھوڑتی تھی۔ اس قربانی کا سراسر فائدہ تحکم کی جگہ پر بیٹھے افراد کو ہی ہوتا تھا اور یہی سب سے بڑی شہادت ہے کہ ایسے مقدس رویے، کس طرح خاموشی سے افراد کو استعمال کر لیتے تھے۔

طاقت کی بنیاد پر اپنی ذات کو بڑا ثابت کرنا، دراصل اپنی لوٹ کھسوٹ کو عام لوگوں کی نظروں سے چھپانے کا ایک ذریعہ ہے۔ مثال کے طور پر ایک دیہات کے کسانوں کی کل پیداوار کا 50 فیصد اگر بادشاہ لے جائے، 25 فیصد علاقے کا زمیندار لے جائے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ کسان یہ نہ سوچے کہ اس کی محنت کی کمائی کو اس سے چھین لیا گیا ہے۔ یہ بنیادی اور سادہ سی بات ہے۔ یہ بات زمیندار کو بھی معلوم ہے کہ اس نے کسان کی کمائی کو ناحق لوٹا۔ اس بے انصافی کے معاملے کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ کسان زمیندار کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور اپنی کمائی کو نہ لٹنے دیں۔ مگر تاریخ میں معاملہ الٹ رہا۔

زیادہ تر کسانوں نے مجبوراً فرض کے طور پر بادشاہ کو بھی اپنے اناج کا حصہ دیا اور زمیندار کو بھی، اس کا طے کردہ حصہ پہنچایا ــــ آخر ایک کسان یا کسانوں نے ایسا کیوں کیا؟

بادشاہ نے اپنے ساتھی زمینداروں کے ساتھ مل کر طاقت کا ایک وسیع نظام قائم کیا۔ طاقت کی بنیادی بات یہ ہے کہ آپ کسی چیز یا جاندار پر اپنی خواہش کے مطابق اثر انداز ہونا چاہتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ نے لکڑی میں ایک کیل رکھ کر اسے ٹھونکا، کیل لکڑی کے اندر گھس گیا۔ آپ نے لکڑی کو درمیان سے کاٹنا چاہا۔ آپ نے آری سے کاٹ لیا۔ آپ نے لکڑی کو چھوٹے چھوٹے ذرّوں میں پیس دیا۔ آپ جو چاہیں، لکڑی کے ساتھ کر سکتے ہیں کیونکہ لکڑی کا خود اختیاری شعور نہیں ہے۔ ہاں البتہ، چیزوں کے فطری وصف اور خصوصیات ہیں جن کے مخالف جانا، ممکن نہیں۔ آپ فرنیچر بنانے والے اوزاروں سے لوہے کے ٹکڑے نہیں کر سکتے۔ جانداروں کی خصوصیات ہیں مگر وہ جبلتی شعور (Instinctual Consciousness) کے تابع ہوتی ہیں۔ کچھ جانوروں کو ان کے فطری اوصاف اور جبلتی شعور سے الگ کر کے سدھایا جا سکتا ہے جیسا کہ بندر کو تماشا دکھانے کے ہنر سکھانے کے لیے، اذیتیں دے کر سدھایا جا سکتا ہے، مرغی کو نہیں۔ اسی طرح پالتو جانوروں کو ان کے مخصوص جبلتی شعور کے تحت سدھا کر استعمال کیا جاتا ہے، جیسا کہ گھوڑا، گدھا، اونٹ، کتا اور بلی وغیرہ۔

انسان اپنی شعوری ساخت میں ایسا جاندار ہے جو اپنے ساتھ اور اردگرد ہونے والے واقعات و حادثات پر غور و فکر کرنے کی اہلیت رکھتا۔ صرف غور و فکر ہی نہیں، اس کے نتیجے میں اپنے آپ کو بدلنے اور اپنے اردگرد ماحول کو بدلنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی وہ صلاحیت ہے جو انسانوں کو دیگر جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ انسانوں پر اپنی طاقت کا استعمال کرتے وقت، طاقت استعمال کرنے والے کو مسلسل خوف رہے گا کہ طاقت کی زد میں آنے والا اپنی غور و فکر کی فطری صلاحیت کی بنا پر کوئی رد عمل کر سکتا ہے۔ غور و فکر کا مطلب سوال اٹھانا ہے لیکن اس کا تدارک تقدیس کے عمل کے دوران کر دیا گیا تھا۔

اگر غور و فکر کی صلاحیت متحرک نہ بھی ہو تو بھی انسان، جسمانی یا ذہنی اذیتوں کو یقیناً محسوس

کرسکتا ہے۔ کسی کے لیے خوشی یا مسرّت کا باعث بننا بھی اس پر اثر انداز ہونے والی بات ہی ہے۔ مگر کوئی شخص خوشی اور مسرت ملنے پر کیونکر اعتراض کرے گا۔ یہ تو اس کی اوّلین خواہش ہوگی۔ البتہ وہ کبھی بھی اذیّت کو اپنی خواہش قرار نہیں دے گا۔ اگر کوئی شخص، دوسرے کو اذیّت دینے پر قدرت رکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کی مرضی کے خلاف اسے پریشان کرسکتا ہے۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں سے طاقت، تحکّم والا نظام اور ان سے منسلک رویّے پھوٹتے ہیں۔ طاقت والے رویّے، دراصل معزز ہونے کے لیے بنیادی قرار دے دیے گئے۔ یعنی معزز ہونے کا مطلب دراصل دوسروں کو قابو رکھنے اور انھیں جسمانی یا ذہنی اذیّت دینے کی قدرت تھی۔ اسی کی بنیاد پر اکثریتی آبادی کو سدھایا گیا۔

انھی اذیتوں کو آداب اور رسوم کی شکل دے دی گئی۔ روزمرہ زندگی میں ان کو جزئیاتی سطح پر اپنانے کے لیے حدود کی نشاندہی کردی گئی۔ یہ حدود، آداب اور رسوم کی صورت میں ہر مقدس ہستی اور رویّے کے ساتھ منسلک کردی گئیں۔ مثال کے طور پر جب کوئی غریب کسی زمیندار کے سامنے آئے یا کوئی ماتحت، کسی بڑے افسر کے سامنے تو اسے بہت سی رسوم اور جسمانی حرکات پر باریکی سے عمل کرنا ہوگا۔ غریب یا ماتحت کو، زمیندار یا افسر کے سامنے کیسے کھڑا ہونا چاہیے۔ اس کا سر، دھڑ اور یہاں تک کہ آنکھوں کی جنبش اور ان میں جھلکتا تأثر کیا ہوگا۔ اگر وہ بیٹھے تو اس کا انداز کیا ہوگا، اگر غریب کو شاباش دینا ہو تو کیسے الفاظ استعمال کیے جائیں گے۔ غریب شاباش ملنے پر کن الفاظ میں احسان مندی ظاہر کرے گا۔ خیرات دینے اور لینے کے آداب کیا ہوں گے۔ حاکم اور محکوم کے تعلق کو برقرار رکھنے کے لیے رسوم و قیود کا ہونا اور ان پر مکمل طور پر عمل درآمد لازم ہے۔ بصورت دیگر اگر حقیقی انسانی صورت حال ہو تو اس میں بے ساختگی (Spontaneity) کا آنا قدرتی بات ہے۔ بے ساختگی میں تحکم والا ماحول برقرار نہیں رہ سکتا۔

قبائلی/زرعی نظام معیشت میں مرد اور عورت کا باہمی رشتہ اجتماعی صورت حال میں بندھا تھا۔ یہ رشتہ وسیع تر مروجہ نظام کو چلانے کے لیے ایک بنیادی محرک کا کام کرتا تھا۔ اس رشتے کے تحت مرد اور عورت دونوں اپنی جنسی آسودگیوں میں خودمختار نہ تھے۔ یہ ممکن بھی نہ تھا کیونکہ رشتے اپنے اثر کے اعتبار

سے احساس ملکیت (Sense of Possession) کے تابع تھے۔ عورت سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ بیٹے پیدا کرے۔ بیٹوں کی پیدائش کا مطلب زیادہ سے زیادہ ہاتھوں کی دستیابی تھا۔ بیٹیوں کی بجائے، بیویوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ بیویوں کی صورت میں گھر بار سنبھالنے والے ہاتھ مل جاتے تھے۔ چونکہ اُس معاشرت میں محنت کرنے والا حقیر سمجھا جاتا تھا، اس لیے کسی کو اپنی بیٹی دینا، دراصل پورے خاندان کی عزت کا معاملہ بن جاتا تھا۔ عورت مرد کے نطفے کو اپنے پیٹ میں پال کر، نہ صرف اسے جنم دیتی تھی بلکہ اسے پال پوس کر بڑا بھی کرتی تھی۔ اس فرض کی ادائیگی میں وہ ایک مزدور کی طرح محنت کرتی تھی۔ اسی مناسبت سے عورت کی سماجی حیثیت، اس کے سماجی کردار یعنی محنت کرنے کی وجہ سے ادنیٰ تھی۔ اگر وہ لڑکے پیدا کرے تو ٹھیک، ورنہ اس کی جگہ لڑکوں کی پیدائش کے لیے دوسری بیوی کا بندوبست کرلیا جاتا تھا۔ اس طرح میاں بیوی کا تعلق مجموعی اقتصادی نظام کی ضرورتوں کے تحت، صرف ایک وسیع ضرورت کا آلۂ کار رہ گیا۔ اس میں شخصی تعلق اور پسندیدگی کی گنجائش نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ محنت کی تقسیم میں جس طرح مختلف کاموں کو ادنیٰ اور اعلیٰ قرار دے دیا گیا تھا، اسی طرح عورت اپنے 'کام' کے اعتبار سے مرد کی محتاج بن گئی۔ اس کا سماجی درجہ مرد کے مقابل ادنیٰ قرار دے دیا گیا۔ اس کی بے اختیاری اور محتاجی کو 'نسوانیت' اور مرد کی حاکمانہ حیثیت کو 'مردانگی' کے مقدس رویّوں سے باندھ دیا گیا۔ عورت کی حیثیت ایک ملکیت (Property) کے برابر قرار دے دی گئی۔ اس کے اردگرد 'چادر اور چاردیواری' کا حصار دراصل اس کی خوداختیاری کو ختم کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ واضح رہے کہ احساس ملکیت میں اختیار کا عنصر لازم ہوتا ہے یعنی یہ کہ آپ کی ملکیت، آپ کی مرضی کے تابع رہے۔ تبھی وہ حقیقی ملکیت ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی کہ اس احساسِ اختیار کے باعث وہ صرف آپ کے لیے ہی ہو۔ انھی احساسات کو 'غیرت' کا نام دے کر مخصوص رویّوں کی صورت دے دی گئی اور عورت کے اردگرد بننے والے نظام معاشرت سے ایسی فصیلیں بن گئیں، جن کو عبور کرنا ممکن نہ تھا۔ ان فصیلوں کو پھلانگنے پر قتل و غارتگری کرنا مقدس روایت سمجھی جانے لگی۔

اس تمام تر صورت حال میں مرد اور عورت نہ صرف یہ کہ جنسی خوشیوں میں خودمختار نہ رہے بلکہ ان کا تعلق ایک وسیع تر اقتصادی ترجیحات میں باندھ دیا گیا۔ اسی فطری محرومی کا اظہار اجتماعی طور پر رومانی

قصوں میں ہوا۔ محبت اور محبت کرنے والوں کے ایسے کردار پیدا ہوئے، جو سب کی دبی خواہشات کی عکاسی کرتے تھے۔

زرعی معیشت کی بنیاد پر بڑی بڑی سلطنتیں پیدا ہوئیں۔ ان سلطنتوں کی بنیاد ایک عام کسان کی محنت سے پیدا ہونے والی دولت پر تھی۔ جب حکمران طبقے کی عیاشیاں اور اصراف مجموعی پیداواری صلاحیت سے متصادم ہو گیا تو یہ سلطنتیں ختم ہو گئیں یا ان کی جگہ دیگر سلطنتیں پیدا ہو گئیں۔ اس تبدیلی میں وہ لوگ کامیاب ہوئے جو پیداواری وسائل کو نئی ترتیب دینے کے لیے پہلے سے بہتر ٹیکنالوجی رکھتے تھے۔ جن لوگوں نے محض بہتر حربی قوت سے ایک زوال پذیر، تھکی ہوئی معیشت پر قبضہ کیا، انھوں نے ظلم و زیادتی کی بنیاد پر رہی سہی پیداواری صلاحیت کو آخری قطرے تک نچوڑ تو لیا مگر مقامی کسان برباد ہو گئے۔

وسائل پیداوار کو بڑھانے کے لیے بہتر تکنیکی ایجادات کی طرف توجہ دینے کی بجائے زیادہ سے زیادہ بڑے علاقوں کو اپنی سلطنت کا حصہ بنانے پر زور دیا گیا۔ ہزاروں سال اسی محرک کے تحت سلطنتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں۔ ان کی جغرافیائی حدود بدلتی رہیں۔ چونکہ ایک عام آدمی یا کسان کا اجتماعی معاشی نظام میں کردار اور رشتہ بدستور ایک جیسا ہی رہا، اس لیے رویّوں اور اجتماعی نفسیات میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ آئی۔

IV

ہمارے علاقے میں جدید ریاستی نظام، نوآبادیاتی نظام کے ساتھ آیا۔ نوآبادیاتی نظام بنیادی طور پر یورپ میں فیوڈلزم کے اقتصادی طور پر مزید آگے نہ بڑھنے کے باعث سرمایہ داری کے پیدا ہونے کے ساتھ پیدا ہوا۔ یورپی فیوڈلزم جب اپنے اثر اور افزائش کے لحاظ سے ختم ہو گیا تو اس وقت تاجرانہ سرگرمیوں سے نئے اقتصادی امکانات پیدا ہوئے۔ ان امکانات کو جب پذیرائی ملی تو زیادہ سے زیادہ 'چیزیں' بنانے کے لیے خام مال کی ضرورت پیش آئی۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے تاجروں نے اپنی حکومتوں کے ساتھ مل کر ایسے علاقوں کے وسائل کو اپنی دسترس میں لانا شروع

کر دیا جو ماضی میں بڑی سلطنتوں کا حصہ تھے۔ یہ علاقے اپنے حکمران طبقوں کی لامحدود ہوس پرستی کے باعث اپنی پیداواری استعداد ختم کر چکے تھے۔ نوآبادیاتی نظام نے نئے ریاستی نظام کے تحت ان علاقوں کے وسائل کی افزائش کی۔ ان وسائل میں انسانی، زرعی اور معدنی وسائل شامل تھے اور ان کو یورپ میں پیدا ہونے والی نئی پیداواری سرگرمیوں کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس نظام کے اہم مقاصد یہ تھے:

i- قابلِ فروخت اشیا بنانے کے لیے خام مال حاصل کرنا۔

ii- زیادہ سے زیادہ قابلِ ضرورت اشیا بنانے کے لیے مشینوں کی ضرورت۔

iii- مشینوں یا ہاتھ سے بنائی اشیا کے لیے محنت کی ضرورت۔

iv- تیار شدہ اشیا کو بیچنے کے لیے منڈیوں کی ضرورت۔

اس سارے عمل: خام مال ———> اشیاء ———> منڈی میں فروخت ——— کا مقصد سرمایہ (Capital) پیدا کرنا تھا۔ ایک چکر مکمل کرنے کے بعد سرمایہ، منافع کما کر اپنی افزائش کرتا ہے اور پھر افزائش کے دوسرے چکر میں داخل ہو جاتا ہے۔ سرمایہ داری نظام میں بنیادی محرک یہی ہے کہ سرمایہ حرکت میں رہے۔ اگر یہ حرکت نہ کرے تو سرمایہ اپنی منافع کمانے کی حیثیت کھو بیٹھتا ہے۔

بادشاہت کی طرح سرمایہ دارانہ نظام بھی جابرانہ ہے۔ دونوں نظاموں میں عام آدمی کا رشتہ مجبور کا ہی رہا۔ سرمایہ دارانہ نظام اپنے مقاصد کے اعتبار سے بادشاہی نظام میں پھول پھل نہیں سکتا تھا۔ بادشاہی نظام اپنی ساخت کے اعتبار سے زرعی اقتصادیات اور اس سے منسلک نظام معاشرت کے لیے مؤثر تھا۔ سرمایہ داری نظام کی افزائش اور استحکام کے ساتھ ساتھ ریاستی نظام بھی بدلتا گیا۔ جدید ریاستی نظام دراصل سرمایہ داری نظام کے تحفظ کے لیے ایک کارگر ادارے کے طور پر وجود میں آیا۔

جدید ریاستی نظام، بادشاہت کی طرح واضح طور پر شخصی نظام نہیں۔ اس کا ڈھانچہ شخصی صوابدید کی بجائے غیر شخصی نظام قانون (Depersonalized System of Law) کی بنیاد پر کھڑا ہے۔

جس طرح بادشاہی نظام میں کچھ مقدس روایات اور ہستیوں کو انسانی اختیار اور سوال سے ماورا قرار دے دیا گیا تھا، اسی طرح جدید ریاستی نظام میں کچھ خوبیوں کو بنیادی تقدیس عطا کر دی گئی:

i- ہر شہری کے لیے یہ لازم قرار دے دیا گیا کہ وہ قانون کی پاسداری کرے۔ انسانی ضروریات خواہ کتنی ہی جائز اور فوری ہوں، اسے قوانین کی گنجلک پیچیدگیوں میں سے گزرنا ہی ہوگا۔ اس سے کوئی مفر نہیں۔ بظاہر قوانین عوامی بہبود کے لیے بنائے جاتے ہیں مگر دراصل یہ شہریوں کو 'وفاداری' کے ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کا طریقہ ہے۔ قانون کی پاسداری ایک خوبی سمجھی جاتی ہے اور اسی 'خوبی' کی مدد سے سماجی کنٹرول کا نظام قائم کیا جاتا ہے۔

خاص طور پر ان ممالک (مثال کے طور پر پاکستان) میں جہاں جدید ریاستی نظام، نوآبادیاتی نظام کی وساطت سے آیا تھا، قانون اور اس کے ساتھ جڑے انصاف کی صورت حال ایسی اچھی نہیں۔ نوآبادیاتی نظام میں قانون کی پاسداری دراصل عوام کو سدھانے کا ایک طریقہ تھا اور اوپر کی سطح پر قانون دراصل ان لوگوں کے مفادات کے لیے ہی بنایا جاتا تھا جو سرمایہ دارانہ نظام کے حقیقی منتظم تھے یا اس گروہ کے حلیف تھے۔

ii- جدید ریاستی نظام میں عام لوگوں کو یہ سمجھایا گیا کہ ان کے ووٹ سے ہی ریاستی ڈھانچہ استوار ہوتا تھا۔ ووٹ علامتی طور پر ایک شخص کی انفرادی مرضی کو تو ضرور ظاہر کرتا ہے مگر اس کی حقیقی صورت دراصل اس نظام میں اس کے بے اختیار ہونے کی دلیل ہے۔

ووٹ دینے کے اختیار کو مختلف طریقوں سے مفلوج کر دیا جاتا ہے مثلاً میڈیا میں مخصوص تأثر دے کر لوگوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ 'جیتنے والے' امیدوار کو ووٹ دیں۔ اس سے ایک ووٹر کو تأثر مل جاتا ہے کہ جیسے اس کی وجہ سے ہی فلاں امیدوار کامیاب ہوا۔ ووٹ دینے اور نئی حکومت کے بن جانے میں ایک فرد کو نفسیاتی احساس آسودگی تو شاید ضرور مل جاتا ہے مگر حقیقی صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ وہ اپنی انفرادی حیثیت میں پھر اس وسیع نظام میں الجھے رکن کی صورت میں ہی رہتا ہے۔

iii- جدید ریاستی نظام میں قانون کی عملداری کے لیے بیوروکریسی کا نظام ہے اور ریاستی

گروہ اسی نظام کے ذریعے ملک کا انتظام چلاتا ہے۔ قوانین کا نفاذ درجہ بدرجہ اختیار کے نظام کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس زنجیر میں نیچے کی سطح پر کارکنان کی تعداد زیادہ ہوتی ہے جو اوپر کی طرف کم سے کم ہوتی ہوئی چند افراد تک محدود ہو جاتی ہے۔ اوپر کی سطح پر چند سو افراد وسیع تر انتظامی فیصلے کرتے ہیں۔ تحکمانہ تأثر پیدا کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے درجہ وار انتظامی ترتیب اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ہر کڑی یا حلقۂ زنجیر، اپنی سطح اور حیثیت میں محدود اختیار تو رکھتی ہے مگر وہ اپنی ذات میں خود مختار نہیں ہوتی۔ اس طرح بیوروکریسی کے نظام میں اعلیٰ سے ادنیٰ تمام درجات اپنی حیثیت میں اوپر اور نیچے موجود کڑیوں میں پابند ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے اختیارات کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔

بیوروکریسی کی بنیاد اس فارغ البال حکمران گروہ نے رکھی جو خود کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ابتدا رومن سلطنت میں ہوئی۔ مگر حتمی اختیار اسی حکمران گروہ کے پاس رہا۔ تاہم اس گروہ کی خواہشات وترجیحات کے مطابق جو استحصالی نظام بنا اس کے مؤثر پھیلاؤ (درجہ وار) کے لیے مرکزی کردار بیوروکریسی (سول وملٹری) نے ادا کیا۔ جب حکمران گروہ خاص طور پر نوآبادیاتی نظام میں، طاقتور تھا تو بیوروکریسی ان کے تابع رہی۔ جب حکمران گروہ خاص طور پر تقسیمِ ہندوستان کے بعد کمزور ہو گیا تو بیوروکریسی اپنی ذات میں مرکزی طاقتور گروہ بن گئی۔

iv- سرمائے کی افزائش کے لیے اشیائے صرف (Consumeable Goods) اور ان کے خریدار ہونا ضروری ہے۔ اس سے ایک مخصوص مزاج پیدا ہوا جو ہزاروں سال کے زرعی معیشت پر مبنی تحکمانہ نظام کی جگہ لے رہا ہے۔ اس مزاج کی بنیادی اہم باتیں یہ ہیں:

1- ہر شے بشمول انسانی خدمات (Human Services) قابلِ فروخت اور قابلِ خرید ہے۔

2- کسی بھی فرد کی ذاتی اور سماجی شناخت اس بات پر طے ہوگی کہ وہ کس قسم کی اشیاء رکھتا یا استعمال کرتا ہے۔ گویا اشیا ہی فرد کی ذات کی شناخت (Identity) اس کی توسیع (Extension) اور علامتی مظہر (Symbolic Manifestation) بن گئیں۔

3- ملکیت یادوسروں کواستعمال کر لینے کی طاقت اور ہنراور اس نسبت سے دوسروں کوقابو میں رکھنے کا احساس(Sense of Possession) ہی زندگی کا واحد محرک سمجھ لیا گیا ہے۔

زرعی معاشروں میں چونکہ لوگ زمین سے جڑے ہوئے تھے لہٰذا ان میں مخصوص اقتصادی رشتے پیدا ہوئے۔ چنانچہ یہی بندھے ٹکے رشتے ان کی زندگی کا محور تھے۔ ان رشتوں میں بظاہر گہری وابستگی کا عنصر واضح نظر آتا ہے مگر حقیقت میں اقتصادی مجبوریوں کے تحت کوئی اور انتخاب(Alternative) ممکن نہ تھا۔ اس سانچے سے بھاگ جانے کی گنجائش ہرگز نہ تھی۔ سرمایہ داری نظام کی افزائش بنیادی طور پر منڈیوں والے شہروں یا قصبوں میں ہوئی۔ وہاں زمین سے رشتہ بے معنی تھا بلکہ اس کے برعکس منڈی کے اصولوں نے نئے سماجی رشتے پیدا کیے جو زندگی کا نیا چلن بنے۔ یہاں بنیادی تقاضا زیادہ سے زیادہ منافع کمانا ہی تھا۔ یہ بھی ضروری نہ تھا کہ آپ ایک قسم کی اشیاء کی تجارت کرتے رہیں۔ اگر موقع ملے تو تجارت کا مال بھی بدلا جاسکتا تھا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل وحمل کی جاسکتی تھی۔ معاشی تقاضوں کی بنیاد پر جو تبدیلی آئی اُس نے شہریوں کا مزاج بھی بدلا۔ آہستہ آہستہ ناگزیر طور پر ایک صارفانہ مزاج (Consumer Mind) پیدا ہوا۔ یہی مزاج سرمایہ دارانہ معیشت کی ترقی کی بنیاد ہے۔ صارفانہ مزاج میں افراد کی شناخت، ان کی صارفانہ حیثیت یا مفاد (Status and Benefit of Consumer) سے وابستہ ہوگئی۔ کسی بھی شخص کو صرف سماجی یا تجارتی رشتوں میں باندھ کر رکھنا، محض بوجھ بڑھانے والا معاملہ ہے۔ کارآمد حکمتِ عملی یہ ہے کہ ''استعمال کرو اور تلف کرو'' (Use and Dispose off)۔

صارفانہ مزاج محض ایک سماجی رویّہ ہی نہیں، اس سے ایک مخصوص شعورذات (Consciousness of Self) بھی پیدا ہو۔ ہر شخص اپنی عافیت اسی میں سمجھتا ہے کہ وہ ہر وقت بکنے کے تیار رہے۔ وہ اپنے آپ کو دوسرے کے سامنے اپنی صارفانہ / تجارتی اہمیت کے نظریے سے پیش کرے۔ وہ اپنے طور طریقے (Persona) 'مارکیٹ' میں لوگوں کی صارفانہ نظروں میں رہنے کے

حساب سے گھڑتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی سماجی بقا اس میں ہے کہ وہ مارکیٹ کے تقاضوں کے مطابق اپنے اندر افادیت پیدا کرنے اور خود کو پُرکشش فروختنی شے میں ڈھال لے۔ 'مارکیٹ' میں آنے والی تبدیلی کے حساب سے اسے اپنی ذات کی پیش کش (Presentation) کو بدلنا پڑے گا—اس طرح صارفانہ شعورذات رکھنے والے شخص کی شناخت بدلتی رہتی ہے۔

چونکہ اس گھن چکر میں بنیادی تبدیلی، چیزوں کی ملکیت اور استعمال کے حوالے سے آتی ہے، اس لیے ایسا شعورذات، فرد کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اپنی ذات کو بھی ایک 'شے' ہی سمجھے۔ ایسی شے جو مارکیٹ میں طلب (Demand) کے مطابق اپنا آپ نئے انداز میں پیش کر سکے۔ وہ دراصل 'مارکیٹ کا آدمی' (Market Man) بن جاتا ہے۔ ایسی شعوری کیفیت میں مستقل رہنے سے اس شخص کے رویّوں اور مزاج میں سب سے طاقتور محرّک اور احساس صرف اور صرف خریدنا یا بیچنا ہی ہوتا ہے یعنی ملکیت رکھنے یا کسی کی ملکیت بن جانے (To possess something/someone or be possessed by something/someone) سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ زندگی کی تمام سوچ اور غالب رویّے صرف احساس ملکیت کے تابع ہو جاتے ہیں۔ ایسا شعور، رشتہ قائم کرنے (Belonging) کی اہلیت نہیں رکھتا اور نہ ہی اسے ایسا کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لہٰذا سماجی رشتے بھی اسی سوچ کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں، جن کی نوعیت محض کاروباری ہوتی ہے۔

سرمائے کی افزائش یا سرمایہ داری نظام کی نشوونما اس بات پر ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ اشیا خریدیں۔ اگر اشیا کو محض ضرورت کے تحت خریدا جائے تو اشیائے صرف کی طلب ایک حد تک رہے گی۔ جس کا مطلب ہے سرمائے میں اضافہ ایک مقام پر رُک گیا۔ چنانچہ سرمائے میں مزید اضافے کے لیے اشیائے صرف کے نئے نئے ڈیزائن تیار کر کے اشتہاری مہم کے ذریعے ضروریات کی طلب کو مصنوعی طور پر بڑھایا جاتا ہے۔ اشتہارات کی مدد سے ان کی ضرورت کے بارے میں ایک احساس پیدا کیا جاتا ہے کہ کوئی بھی صارفانہ مزاج والا شخص ان کی عدم ملکیت کی صورت میں اپنی زندگی کو ادھورا سمجھے گا۔ وہ ایسا محسوس کرے گا کہ جیسے وہ 'مارکیٹ' سے باہر ہو جائے گا۔ سرمایہ داری نظام میں اشتہار بازی

سرمایہ بڑھانے کا انتہائی کارگر حربہ ہے کے ذریعے صارفانہ مزاج رکھنے والوں کو بلا ضرورت اشیا خریدنے پر مائل کیا جاتا ہے۔ اشیائے ضرورت میں اختراع کے ذریعے جدّت پیدا کی جاتی ہے اور ان کی افادیت میں اضافہ کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ اس طرح موجود اشیا فرسودہ بن جاتی ہیں۔ اس طرح تھوڑے تھوڑے وقفوں سے سماج میں نیا چلن، رواج یا فیشن پیدا کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مارکیٹ کا آدمی اپنے اندر تنوع پیدا نہ کرے تو وہ بھی فرسودہ ہو جاتا ہے۔ مارکیٹ میں اپنی قدر و قیمت (value) قائم رکھنے اور بڑھانے کے لیے نئے نئے علوم اور ٹیکنالوجی سے آراستہ کرنا ناگزیر بن جاتا ہے۔ اسی طرح وہ مارکیٹ میں مستعد رہنے کے احساس (Feeling of being active and alive) سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ اس طرح اشیائے صرف سے منسلک نئے انداز اور اسٹائل (New patterns and styles) پیدا کیے جاتے ہیں۔ ان نئے انداز اور اسٹائل کی بنیاد نئے برانڈ کی اشیا پر ہوتی ہے۔ ایسے میں صارفانہ ذہن والا فرد سوچتا ہے کہ 'اگر میرے پاس یہ چیز ہوگی تو میں سماجی مارکیٹ میں اپنی موجودگی کا احساس برقرار رکھ سکتا ہوں۔۔۔''

زرعی معاشروں میں فرد کی شناخت، اجتماعی احساسات کے تناظر میں ہی سنورتی تھی۔ یعنی اس کی انفرادی حیثیت کے معانی اجتماعیت کے بغیر ممکن ہی نہ تھے۔ زرعی معاشروں میں کوئی فرد انسانی قربت اور انفرادی مسرّت، اجتماعی سرگرمیوں سے ہی حاصل کرتا تھا۔

صارفانہ مزاج رکھنے والا شخص اپنے اردگرد بسے افراد اور اداروں کے ساتھ صحت مند رشتہ قائم کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ دوسری طرف وہ فیشن کی لہر (Fashion craze) کا غلام ہوتا ہے۔ فیشن کی لہر دراصل ایک اجتماعی بخار ہوتا ہے اور صارفانہ مزاج کے لیے سراسر متعدی۔ افراد اور معاشرے کے ساتھ رشتہ قائم کرنے سے گریز مگر دوسری طرف فیشن کی لہر جو اپنی ساخت (Form) میں اجتماعی ہوتی ہے کا اسیر ہونا، بظاہر ایک تضاد لگتا ہے۔ صارفانہ مزاج والا شخص واقعتاً اسی تضاد میں زندہ رہتا ہے۔ اس تضاد کو سمجھنے کے لیے یہ باتیں غور طلب ہیں:

i- جیتے جاگتے انسانوں کے مابین رشتہ استوار کرنے میں دونوں طرف سے آمادگی اور

قبولیت (Acceptance) ضروری ہے۔ ایسا تعلق جس میں ایک شخص دوسرے کو استعمال کرے، رشتہ نہیں ہو سکتا۔ صحیح انسانی رشتہ وہ ہے جس میں دونوں شخص ایک دوسرے کو خامیوں اور خوبیوں سمیت قبول کر لیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ رشتہ انسانی زندگی کے تحفظ اور فروغ کے لیے ضروری معاملات سے متصادم نہ ہو۔ ایک چور کا دوسرے چور سے باہمی مفادات کا رشتہ ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں چور، ایک دوسرے کے مفادات کا خیال رکھیں۔ چونکہ ان کا رشتہ اپنے جوہر (Essence) کے اعتبار سے انسانی زندگی کے تحفظ سے میل نہیں کھاتا، اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔

صارفانہ مزاج کے تحت بننے والے رشتوں میں بنیادی محرک اور حتمی مقصد صرف استعمال کرنا یا استعمال ہو جانا ہے۔ اس لیے اس میں انسانی زندگی کے تحفظ کی گنجائش نہیں رہتی۔ ایسے ماحول میں کسی بھی فرد کی قابلِ استعمال خصوصیات کو ہی ترجیح دی جاتی ہے اور دیگر شخصی لوازمات کی نفی کر دی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے ہاں رشتوں کے نظام میں عورت کا خوبصورت ہونا لازمی ہے۔ اگر کوئی عورت خوبصورت نہیں تو وہ خواہ کس قدر قابل اور ہونہار ہو، اسے قبولیت نہیں ملے گی۔

ii- صارفانہ مزاج دراصل قدیم دَور سے چلی آ رہی اس ترکیب (Prescription) کا تسلسل ہے، جس میں جادو (Homeopathic Magic) کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس جادو کا بنیادی خیال یہ تھا کہ 'اگر یہ ہو جائے تو ایسا ہو جائے گا•••' اگر بہت ضعیف مرد یا عورت پر کیچڑ بھرا پانی پھینک دیا جائے تو بارش ہو جائے گی۔ اگر ایک گڑیا کو دشمن مان لیا جائے اور اس میں سوئیاں چبھو دیں تو دراصل یہ سوئیاں دشمن کے جسم میں لگیں گی۔ اگر اتنی عبادت یا ورد کر لیا جائے تو بچے کو نوکری مل جائے گی۔ اگر فلاں مذہبی رسوم ادا کر لی جائیں تو دشمن پر فتح نصیب ہوگی اور اگر میرا خوش قسمت ہندسہ، لاٹری کے ٹکٹ پر آ گیا تو انعام جیت جاؤں گا، وغیرہ وغیرہ۔

جادو کا یہ طریقہ کامیاب ہو یا نہ ہو، یہ بات طے ہے کہ اس کو ماننے والے کی ذہنی / شعوری کیفیت کے بارے میں ضرور پتا چلتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے معاملات میں بے اختیار ہے۔ وہ حقیقی وجوہات کو سمجھنے کی بجائے محض خواہشات کا اسیر ہے۔ یا یہ کہ وہ اپنے حقیقی حالات اور ان کی

وجوہات کو سمجھتا تو ہے مگر وہ ان کو تبدیل کرنے میں بے بس ہے۔ ایسی بند اور محبوس صورت حال میں وہ تجرید (Abstraction) یا ہوائی سطح پر اپنے دل کی تسلی کے لیے کوشش کرتا ہے۔ انتہائی بے بسی کی صورت حال میں کڑھنے کی بجائے ایسے جادوئی اقدامات سے اس کے حالات تو نہیں بدلتے مگر وہ نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو متبادل حیلوں بہانوں میں مصروف رکھتا ہے۔ یہ ایک لحاظ سے غیر مستعد اور غیر شراکتی (Non-participation) مگر مجرد تسکین فراہم کرتے ہیں۔

صارفانہ مزاج کا حامل شخص بھی یہی سمجھتا ہے بلکہ یقین کرتا ہے کہ 'اگر فلاں چیز اس کی زندگی میں آ جائے تو وہ فیشن کی مروجہ لہر کا حصہ رہے گا...' اسی یقین کے اردگرد اس کا شعور سنورتا ہے اور اس لحاظ سے جادو کرنے والے کی طرح وہ بھی بے اختیار، مجرد خوشی اور غیر شراکتی تسلیوں کا غلام ہو جاتا ہے۔ اس کا اردگرد کے لوگوں اور اداروں سے تعلق غیر شراکتی مسرتوں (Vicarious Pleasures) میں مقید رہتا ہے۔ وہ مفروضہ خیالی حظ اٹھانے میں مگن رہتا ہے۔

زرعی نظامِ معیشت میں انسانوں کو استعمال کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کیا جاتا تھا۔ طاقت کے وسیع تر پھیلاؤ اور لوگوں کو بے اختیار بنانے کے لیے، تحکمانہ نظام (Authoritarian System) تھا۔ بادشاہی نظام ہو یا سرمایہ داری صارفانہ مزاج، ہر دو میں بنیادی ہتھکنڈے طاقت اور اتھارٹی کے اردگرد ہی گھومتے ہیں۔ کسی جانور کو شکار کرنا، دراصل اسے اپنی طاقت کے زیر تسلط لانا ہے۔ شکار کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ کسی جانور کے پیچھے بھاگیں، اسے تھکا کر پکڑ لیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ دُور سے اس پر تیر یا گولی سے حملہ کریں جس سے وہ زخمی ہو کر وہ گر جائے اور پھر آپ اسے اپنے اختیار میں کر کے ذبح کر لیں۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ مکاری سے پھندہ لگا کر، جانور کو بہلا پھسلا کر، پرکشش ماحول بنا کر پھانسنے کی کوشش کریں۔ شکار کو پتا بھی نہ چلے اور وہ آپ کے اختیار میں چلا آئے۔ چوتھا طریقہ یہ ہے کہ آپ شکار بننے والے کا ذہنی شعور اس طرح ڈھال دیں کہ شکار بننے والا نہ صرف اپنی خوشی سے شکار ہو جائے بلکہ شکار ہو جانے پر فخر بھی محسوس کرے۔ یہی نہیں وہ اس میں اپنی زندگی کی تکمیل کے احساس سے بھی سرشار ہو جائے۔ یعنی یہ کہ شکار ہونے والا ویسے ہی

سوچتا اور عمل کرتا ہے، جیسا کہ شکار کرنے والا اس سے کروانا چاہتا ہے۔ ایسا عمل کروانا اور ایسے مزاج میں انسانوں کو ڈھال دینا، سرمایہ دارانہ نظام کا ہی کمال ہے۔ شکار بن جانا ہی صارفانہ مزاج کی بنیادی تحریک اور مقصد ہے۔ شکار بن جانا، بظاہر اپنے آپ کو کسی کی طاقت کے سامنے بے بس کر دینا ہے۔ اس سے شکار ہو جانے والے میں شدید قسم کا احساسِ شکست اور بے بسی پیدا ہو جانی چاہیے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ صارفانہ مزاج کا شکار بننے والا شکست و بے بسی کے برعکس سماجی بڑائی اور وقعت محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہی احساسِ وقعت (Feeling of pride)، دراصل سرمایہ داری نظام کا خود مدافعتی نظام (Self-preservatory System) ہے۔ واضح رہے کہ کوئی نظام خواہ وہ کتنا ہی انسان دشمن ہو، اس وقت تک کامیابی سے چلتا رہتا ہے جب تک اس میں اس نظام سے متعلق سماجی بڑائی اور وقعت کے مخصوص پیمانے موجود رہیں۔

'مارکیٹ کا آدمی، اپنی انفرادی شناخت لاتعداد شخصی و سماجی رویّوں کی بجائے صرف اور صرف اشیا سے ملکیتی نسبت میں محدود کر دیتا ہے۔ ایسے میں اس کا شعور اور کردار چیزوں میں ہی محدود ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے اردگرد لوگوں اور رشتوں کے ساتھ تعلق بھی چیزوں کے حوالے سے استوار کرتا ہے۔ رشتوں اور دیگر انسانوں کی اس کی زندگی میں اہمیت کا پیمانہ چیزوں سے وابستہ ہو جاتا ہے۔

کیا انسان صرف ایک جسم ہے یا ایک متحرک شعور کا نام ہے؟ اس بات کو عورت کے حوالے سے بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ جنسی روابط اور شناخت کے حوالے سے اگر عورت کو محض ایک جسم سمجھ لیا جائے تو وہ جنسی غرض مندیوں کے حصول کے لیے صرف ایک 'چیز' رہ جاتی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ ایک شے ہے جو کسی مرد کی جنسی تسکین کا ذریعہ ہے ـــــ ایسے ہی جیسا کہ ایک شخص پیاس کی صورت میں پانی پینے کے لیے گلاس استعمال کرتا ہے۔ اگر عورت کو جنسی تسکین پہنچانے والی شے سمجھ لیا جائے تو اس کی انسانی حیثیت سے یکسر انکار ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں اس کے انسان ہونے یا ایک فرد ہونے کی گنجائش بھی ختم ہو جائے گی۔

اگر عورت کو جنسی چیز سمجھنا، ایک عمومی رویّہ (General attitude) بن جائے تو عورت کو اپنے آپ کے بارے میں، اپنی سماجی حیثیت کے بارے میں ذاتی شعور (Consciousness of Self) بھی بدلنا ہوگا۔ وہ اپنے آپ کو ایک چیز بنانے کے لیے ضروری کوائف اور خصوصیات کے مطابق ڈھال لے گی اور یہی حیثیت اُس کے شعورِ ذات کی بنیاد پر بنے گی۔ مثال کے طور پر اگر ایک چیز کسی معاملے میں بھی خود مختار نہیں، ایسے میں اس کا ہر عمل کسی دوسرے کے اختیار میں ہوگا اور وہ ہمیشہ ہر کام میں دوسرے کی ہدایت پر انحصار کرے گی۔ یہی نہیں، جس طرح ایک چیز کی اپنی مرضی اور خود اختیاری نہیں ہوتی، اسی طرح اگر ایک انسان اپنے آپ کو ایک 'چیز' سمجھنا شروع کر دے تو اس میں انسان ہونے کا شعور یعنی اس کی مرضی اور خود اختیاری ختم ہو جائے گی۔ وہ مارکیٹ میں موجود ایک شے بن کر رہ جائے گا۔ ایسے میں جب اس کی مرضی اور اختیار مارکیٹ کے تقاضوں کا پابند ہو جائے تو وہ محض ایک جسم ہی رہ جاتا ہے۔ ایسا جسم جس میں انسان ہونے کا شعور بالکل نہ ہو۔ اس صورت حال میں مارکیٹ کے آدمی کا اپنے بارے میں شعور، محض جسم کی حد تک محدود ہو جاتا ہے۔ پہلے تو انسانی برادری کی نصف کے قریب آبادی (یعنی عورتوں) کو محض جسم سمجھ کر، اس کے شعورِ ذات کو جسم تک محدود کر دیا گیا ہے۔ صارفانہ مزاج کے غلغلے کے بعد باقی لوگوں کے شعورِ ذات کا محور بھی جسم بن گیا۔ جسم کے اس مخصوص شعورِ ذات میں اہم عناصر یہ ہیں:

1۔ 'میرا جسم میری ملکیت ہے۔ یہ قابلِ فروخت ہے اور اس کو میں مارکیٹ کے تقاضوں کے مطابق بنا سنوار کر پیش کر سکتا ہوں'

2۔ 'میرا جسم چونکہ قابلِ فروخت ہے، لہٰذا اس کی خاطریں کرنا میرا فرض ہے۔ یعنی مارکیٹ میں مروجہ انداز کے مطابق اپنے جسم کو خوراک کھلانا اور اس کی تسکین کے لیے مروجہ پیمانوں کے مطابق جسمانی لذت حاصل کرنا ضروری ہے۔'

صارفانہ ماحول میں دوسروں سے اپنائیت (Belonging) اور خیال رکھنے (Care) کے سماجی رویے مارکیٹ کے تقاضوں کے تحت تشکیل پاتے ہیں۔ لوگوں کے ساتھ احساس وابستگی یا رشتے کی

جگہ مارکیٹ میں بدلتے انداز (Style) کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا اور اس کی پیروی کرنا ہی بنیادی رویہ بن جاتا ہے۔ صارفانہ مزاج سے مغلوب فرد، اسٹائل، فیشن/رواج اور مارکیٹ کے تقاضوں کے مطابق چیزیں خریدتا اور انھیں اپنی 'سماجی شناخت' کا حصّہ بناتا ہے۔ وہ لوگوں سے انسانی سطح پر تعلق قائم کیے بغیر کسی شے کی ملکیت کو اپنے وجود کا جواز سمجھ لیتا ہے۔ اس طرح 'محض تجریدی سطح پر' کسی شے پر ملکیت کی بنیاد پر سمجھنا شروع کر دیتا ہے کہ اب وہ مارکیٹ میں موجود ہے۔

صارفانہ مزاج سے جہاں انفرادی سطح پر شخصیت تقسیم ہو جاتی ہے وہیں ایسا معاشرہ پیدا ہوتا ہے جو اجتماعیت کو ختم کر دیتا ہے۔ ایسا ماحول فاشسٹ ریاستی نظام کے لیے بہت کارآمد ہوتا ہے۔ صارفانہ مزاج اپنی تمام تر خصوصیات کے اعتبار سے خود پسندی اور انانیت کے شعور پر مبنی ہوتا ہے۔ انسان دوست مزاج کو فروغ دینے والا انفرادی مزاج اس سے مختلف ہے:

i- انسان کا اپنے آپ کو ایک وسیع انسانی برادری کا حصہ سمجھنا۔ ایسا شعور انسانی ضرورتوں کے تحت انسان میں تاریخی طور پر پنپا۔ یہ شعور انسان میں سماجی جبلّت (Social Instinct) کی صورت میں موجود ہے۔ تاریخی طور پر جبر میں رہنے کے باعث یہ احساس ایک مضبوط متبادل کے طور پر استوار ہوا۔

ii- انانیت، دراصل انسانی تحفظ کی جبلّت کے تحت آتی ہے۔ یہ مکمل ذات (Self) کا متبادل نہیں ہو سکتی۔ اگر اسے متبادل سمجھ لیا جائے اور اس پر مجموعی شعور کی بنیاد رکھ دی جائے تو گویا، ایک فرد غیر مکمل شعورِ ذات کے تحت زندگی گزار رہا ہے۔ اور اگر یہ انانیت، محض جسم اور چیزوں میں مقید ہو جائے تو خود پسندی یا نرگسیت (Narcissism) کی صورت حال پیدا ہوگی۔ اگر انسانی تحفظ کی جبلّت مکمل طور پر سماجی جبلّت سے الگ ہو جائے تو دوسرے کا احساس (Empathy) ختم ہو جائے گا۔ ایسے میں شدید نوعیت کا تشدّد اور بے حسی پیدا ہو جائے گی۔

iii- سماجی شعور، نہ صرف فرد کو انسانی برادری میں موجود ہونے کا احساس دیتا ہے بلکہ

انسانوں کے معاملات میں مداخلت کر کے، انھیں بہتری کی جانب ارتقاء کرنے کی استطاعت اور توفیق بھی عطا کرتا ہے۔ صارفانہ مزاج ایک ادھوری شخصیت میں اُنکا ہوتا ہے۔ وہ اپنی انانیت کے بھروسے یا واہمے پر دوسرے انسانوں کی اپنی زندگی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ انھیں اپنے صارفانہ مزاج کے تحت محض استعمال کرنے والی 'شے' تصوّر کرتا ہے۔ ایسے میں وہ سماجی جبلّت سے مکمل طور پر عاری ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص کسی بھی تحکمانہ نظام کے لیے بہت 'مفید شہری' بن جاتا ہے۔

ہم جو چیزیں استعمال کرتے ہیں، وہ اپنی ساخت اور استعمال کے لحاظ سے ایک تاریخ رکھتی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا وجود تاریخی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر گاڑی کے پہیے کو ہی لیں۔ اس پہیے کی شکل وصورت اور افادی حیثیت سنورنے میں ہزاروں سال کا عرصہ لگا۔ اس تاریخی سفر کی ابتدا لکڑی کے گول تنے کے لڑھکنے سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد تجربات اور افادیت میں اضافے کا ایک سلسلہ شروع ہوا اور پہیے کی شکل بہتر سے بہترین ہوتی چلی گئی۔

چیزیں ہی نہیں، انسانی رشتوں میں بھی تاریخی تسلسل اور تاریخیت (Historicity) کارفرما ہے۔ ان رشتوں میں فرد کا ساتھی لوگوں، جغرافیائی صورت حال اور ان دونوں کی بنیاد پر بننے والے اداروں سے تعلق بنیادی ہے۔ ان تینوں ارکین یعنی ساتھی لوگوں (Fellow People)، جغرافیائی صورتحال (Environment) اور ان دونوں کے آپسی تعلق کی بنیاد پر بننے والے اداروں (Institutions) کا مجموعی تجربہ جب تسلسل کے ساتھ آنے والی نسل کو منتقل ہوتا رہا ہو تو ایسے میں ان تمام ارکین کی حیثیت تاریخی ہوگی۔ جب تسلسل کے ساتھ یہ عمل جاری رہا تو ایک شعور نکھر کر سامنے آیا جو اپنی ساخت (Form) اور روح (Essence) کے اعتبار سے تاریخی تھا۔

تاریخی شعور کچھ معاشروں، خاص طور پر قبائلی اور زرعی معیشت پر مبنی معاشروں میں بڑا واضح نظر آتا ہے۔ ان معاشروں کے لوگوں کی عمومی زندگی اور ان کی ترجیحات میں اس تاریخی شعور کی واضح نشاندہی ہوتی ہے۔ اس تاریخی شعور پر فخر کیا جاتا ہے اور اسی کی بنیاد پر دوسروں سے الگ شناخت تعمیر کی

جاتی ہے۔ مثال کے طور پر عرب معاشروں میں جہاں قبائلی رہن سہن تھا، بچوں کے نام باپ، دادا اور پھر جدامجد کے ساتھ نسبت کے حساب سے رکھے جاتے تھے۔ یہ سب نام بچے کے نام کا حصہ ہوتے تھے۔ کچھ علاقوں میں خاندانوں کے نام کسی بزرگ یا ایسے شخص کے نام پر رکھے جاتے ہیں جن کا ان لوگوں کی اجتماعی زندگی میں اہم کردار رہا ہو۔ اکثر لوگ اپنی روحانی حیثیت قائم کرنے کے لیے اپنے نام کے ساتھ کسی بڑے بزرگ کا نام لگا دیتے ہیں۔

قبائلی اور زرعی معاشرتوں میں تاریخی شعور کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ لوگوں کا ایک تسلسل کے ساتھ ایک جگہ رہنا، ایک جیسے اقتصادی نظام میں روزی کمانا اور مشترکہ تجربات سے گزرنا ہے۔ ان معاشروں میں ہر معاملہ ایک تسلسل اور یکسانیت کے ساتھ سینکڑوں سالوں تک چلتا تھا۔ بادشاہت کا تسلسل، رشتوں کا تسلسل، زمین سے رشتے کا تسلسل، مذہبی رسومات کا تسلسل، یہاں تک کہ زندگی کے دکھوں اور خوشیوں میں بھی یکسانیت کا تسلسل جاری رہتا تھا۔ ایسے شعوری نظام میں جو چیزیں، اس تاریخی شعور کا حوالہ بنتی ہیں، ان میں اہم بزرگوں سے منسوب قصے، قبرستان، عمارات یا درخت وغیرہ شامل ہیں۔ دوسرا اہم حوالہ لوک روایت یعنی لوک ادب، موسیقی اور فنون ہیں۔ ہر نسل کی تربیت انھی حوالوں سے کی جاتی ہے اور اس طرح تاریخی شعور آنے والی نسلوں کو منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یہی نہیں، اس تاریخی شعور کے اندر کسی بھی ترمیم یا انحراف کی گنجائش ختم کرنے کے لیے ایک خود حفاظتی نظام بھی موجود رہتا ہے۔ انحراف یا ترمیم کی صورت میں صرف یہ کہنا کہ 'بزرگوں کو کیا منہ دکھائیں گے؟ یا یہ کہ 'ایسا کبھی سنا ہے نہ کبھی کسی کو کرتے دیکھا•••!' معاملہ ٹھپ کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ واضح رہے کہ اس خود حفاظتی تدبیر میں معاملات کا حوالہ بہر طور تاریخی رہتا ہے۔

ہمارے ہاں جو تاریخی شعور بنا، اس کا وسیع تر مفاد بادشاہوں اور ان کے حلیفوں کے حق میں تھا۔ اس کا ایک پہلو لازمی طور پر جابرانہ تھا اور اس کا وسیع تر مقصد انسانوں کو سدھا کر انھیں استعمال کرنا تھا۔ ایسے میں یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ تاریخی ورثہ انسانوں کے لیے موزوں ہو۔ اس کی اندھی تقلید کے باعث ہر گھر اور ہر فرد زارا کی ماں کی طرح اپنے پیاروں کی زندگی برباد کر رہا ہے۔ اس پر سوال

اٹھانا لازم ہے۔

دوسری جانب صارفانہ مزاج اپنی ساخت اور عمل کے اعتبار سے ہرگز تاریخی نہیں ہے۔ یہ مزاج کسی تسلسل کا اقرار نہیں کرتا بلکہ اپنے مقاصد کی اسی وقت، فوری (Now or Never) تکمیل چاہتا ہے۔ وہ صرف موجود یا جاری لمحے کے لیے جیتا ہے۔ اس تناظر میں وہ لمبے تاریخی شعور میں بندھا رہنا پسند نہیں کرتا۔ اس میں قبائلی یا زرعی معاشروں کے اندر بسنے والے لوگوں کے انفرادی تاریخی شعور کو برداشت کرنے کی صلاحیت بھی نہیں ہوتی اور نہ ہی خواہش۔ قبائلی اور زرعی معاشروں میں رشتوں کے تسلسل کو بنیادی حیثیت دی جاتی ہے جب کہ صارفانہ مزاج والا شخص رشتوں کے بنانے سے گھبراتا ہے۔ اس کے نزدیک 'دوسروں' کا وجود ان کی کارآمد خصوصیت اور افادیت پر منحصر ہے۔ چنانچہ یہ رشتہ دوسروں کو استعمال کرنے کے لیے ماحول پیدا کرنے اور انھیں استعمال کرنے تک محدود رہتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دوسروں کی 'کارآمد خصوصیت' کو استعمال کرنے کی 'لگن' میں، دوسرے کے 'استعمال ہو جانے' تک انتظار کرلے۔ اس کے لیے وہ 'ضروری ماحول' بھی قائم کرلے۔ چونکہ اس کا بنیادی مقصد دوسرے کو استعمال کرنے تک محدود ہوتا ہے یعنی دوسرے کو اپنے مقصد کے لیے 'کھانا ہوتا' ہے، اس لیے ضروری ماحول اور انتظار کو فریب سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

قبائلی اور زرعی معیشت میں سنورنے والا شعور چونکہ مختلف معاملات میں بندھا ہوتا ہے اور یہ معاملات اپنی جگہ پر وسیع تسلسل رکھتے ہیں، اس لیے ان میں رہنے کے لیے ہر سطح پر سب سے اہم خوبی انتظار کرنا ہی ہوتی ہے —— کھیتی کے پکنے کا انتظار، غریب پرور بادشاہ کے آنے کا انتظار، غربت کٹنے کا انتظار، بچوں کے جوان ہوکر دست و بازو بننے کا انتظار، بڑھاپے میں خدمت گار اولاد ملنے کا انتظار، زندگی سے ذلت کے خاتمے کے لیے کسی غیبی ہستی کے آنے کا انتظار اور مرنے کے بعد بخشش کا انتظار وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ قبائلی اور زرعی معیشت کی بنیاد پر بننے والا شعور دراصل 'انتظار کی ثقافت' کی آبیاری کرتا ہے۔ اس کے برعکس صارفانہ مزاج رکھنے والا شخص 'استعمال کرو اور پھینک دو' والی ثقافت (Disposable Culture) میں بستا ہے۔ اس ثقافت میں ہر چیز پہلے سے تیار (Instant

or Ready to Use) ملنی چاہیے۔

چونکہ مجموعی طور پر معاشرتی محرک (Social Motivation) احساسِ ملکیت کے گرد ہی گھومتا ہے، اس لیے پیار میں ملکیت کا پہلو آنا کوئی اچنبے کی بات نہیں۔ اس میں ایک اور پہلو پیار کی فضا کو قائم کرنا ہے، جس میں جذباتیت (Sentimentalism) اور رومانس کو بطورِ ہتھیار استعمال کیا جاتا ہے۔ اصل معاملہ، مقصد حاصل کرنے کے لیے ملکیت کے اظہار کو سمجھنا ہے۔ چونکہ ملکیت کے لیے نئی چیز پانا ضروری ہے اور یہ بھی لازم ہے کہ آپ اس کی پیکنگ کو اپنے ہاتھ سے کھولیں —— عورت کا باکرہ (Virgin) ہونا ضروری ٹھہرا۔ جنسی رسائی کے بعد عورت، مرد کی ملکیت بن گئی۔

جب جنسی رسائی کا بھوت اتر گیا یا پالینے کا تفاخر ختم ہوگیا تو احساس ملکیت تو برقرار رہا مگر کشش ختم ہوگئی۔ اسے ایسے کھلونے کی طرح اِدھر اُدھر لاوارث پھینک دیا، جس سے بچے کا دل اتر چکا ہو۔ دوستی، تعلق، نسبت اور رشتے سب میں ملکیت اور انھیں استعمال کرنے کا عنصر غالب ہے۔ خاص طور پر صارفانہ مزاج میں تو جذباتیت اور رومانس کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی، فوراً مقصد براری پر معاملہ طے ہوجاتا ہے۔ اصل میں یہ پیار کا جذبہ نہیں ہوتا یہ تو کسی کو پانے، حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے جو پیار کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ محبت کی شادی اسی لیے ناکام ہوتی ہے کہ اس میں حقیقتاً پیار نہیں ہوتا ورنہ تعلقات میں تلخی یا طلاق کی نوبت نہ آئے۔

تحکمانہ نظام، خواہ اس کی جڑیں زرعی معیشت میں ہوں یا سرمایہ داری میں، یہ انسانوں کو غیر انسان بنانے کے عمل میں سرگرم رہتا ہے۔ اس کی گرفت میں کوئی احساس، حقیقی انسانی مزاج سے میل نہیں کھاتا —— تعلق اور پیار بھی تحکمانہ نظام میں مخصوص معانی اور عمل رکھتا ہے۔

3

انسانوں کوسدھانے کے طریقے

جس تاریخی روایت کا ذکر گذشتہ باب میں کیا گیا ہے، اس کے تحت انسانوں کو استعمال کرنے یا نظام معیشت میں ان کی عملی شرکت (Practical Participation) کی حدود طے کرنے کے لیے، مخصوص شعوری سانچے (Formats of Consciousness) بنائے گئے۔ ان مخصوص سانچوں میں صرف ان خصوصیات کو مرکزی حیثیت دی گئی جو پیداواری عمل میں مفید ہو سکتے تھے۔ یہ بنیادی طور پر سدھانے کا ہی وسیع طریقہ تھا۔

کوئی فرد، اپنی جسمانی انفرادیت تو ضرور رکھتا ہے مگر حقیقی شناخت اور انفرادیت کا انحصار اس کے شعور پر منحصر ہے۔ اسی شعور کے تحت اس فرد کا اپنے جسم، اپنے ارادوں (Intentions)، اپنے ماحول اور اپنی تاریخ و روایت سے تعلق قائم ہوگا۔ نہ صرف تعلق قائم ہوگا بلکہ اس کی عملی تگ و دو کا انحصار بھی اسی شعور پر ہوگا۔

سلطنتوں کے ادوار میں غلاموں، کسانوں اور مزدوروں کی وسیع تر تعداد کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کے تحت عام لوگوں کو عمومی شعور یہ دیا گیا کہ ان کا جسم ہی دراصل ان کی انفرادیت (Individuality) اور شناخت کا ذریعہ ہے۔ مرد ہو تو اس کی جسمانی طاقت اس قدر زیادہ ہو کہ وہ سخت سے سخت کام کر سکے بلکہ درندوں کے ساتھ سیدھا مقابلہ کرنے کا بھی اہل ہو۔ عورت ہو تو اس کا جسم اپنی جنسی کشش اور بچے پیدا کرنے کی موزوں ترین قوت رکھتا ہو۔ اس دور میں سدھانے کے لیے جہاں جسم پر منحصر شعوری ساختوں پر انحصار کیا جاتا، وہیں مزاحمت کی صورت میں، شدید بے رحمانہ جسمانی سزاؤں سے کام لے کر انسانوں کو سدھایا جاتا ہے۔

آہستہ آہستہ اور خاص طور پر سرمایہ داری نظام میں انسان کو جب جدید ریاستی نظام میں رہنے کی بندش کا سامنا ہوا تو اس میں جسمانی شعور کا ہونا کافی نہ تھا۔ ریاستی مشینری میں معاملات اس ڈھنگ کے تھے کہ ان کے ساتھ گزارہ کرنے کے لیے سیاسی، سماجی اور تاریخی شعور کی بھی کسی قدر ضرورت آن پڑی۔ بادشاہی نظام شعور سے جدید ریاستی نظام کی طرف تبدیلی میں انسانی آزادی کے امکانات موجود تھے مگر آہستہ آہستہ انھیں لامحدود ہونے کی بجائے محدود شعوری سانچوں میں مقید کر دیا گیا۔ چونکہ جدید ریاستی نظام اپنی تاریخی ساخت کے اعتبار سے فرد کو محض اس کے جسمانی شعور میں قید نہیں رکھ سکتا تھا اور یہ بھی کہ اس نظام کی کامیابی کے لیے سیاسی، سماجی اور تاریخی شعور لازم بھی تھا، شعوری حدود، واضح رہنے کی بجائے مخفی اور نفسیاتی ہو گئیں۔ انسانی شعور کی صورت گری اس طرح کی گئی کہ کوئی فرد وہی سوچتا ہے جو یہ نظام شعور اسے سوچنے پر اکساتا ہے۔ یعنی یہ کہ کسی فرد کے لیے شعوری حقیقت وہی ہے جو دراصل اس نظام شعور کا مطالبہ ہے۔

سدھانے کے شعوری سانچوں میں کچھ معاملات مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھی معاملات کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔

I

تجریدیت (Abstraction)

بوڑھی دادی کا گھر اس سے بھی سو سال بوڑھا تھا، اس لیے وہ گھر کے اندر جہاں بھی ہوتی، اپنے سر ماتھے کو چھوٹا سا گھونگھٹ اوڑھنے کے انداز میں ڈھانپ کر رکھتی۔ گھر میں صرف وہی ایک رہتی تھی۔ دادا کو مرے پورا ایگ بیت چکا تھا۔ دوسری بار موت آئی تو اس نے گھر کا دروازہ بھی نہ کھٹکھٹایا اور اندر گھس کر اس کی اکلوتی اولاد دھنی رام کو ہانک کر لے گئی۔ پھر دو سال میں اس کی بہو بھی اپنے شوہر کے پیچھے ہو لی۔ اس کا پوتا، رام چند اس کے ساتھ ہی رہا کرتا تھا مگر چند سال پہلے جب اسے سرکاری کوارٹر ملا تو وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وہاں سے چل دیا۔ دادی اَڑ گئی کہ اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہ جائے گی۔

دادی تھی تو اکیلی، مگر اس قدر اپنے ساتھ تھی کہ ایک کوٹھری سے دوسری میں جاتی تو پہلے سے ہی وہاں اپنے آپ کو اپنے انتظار میں پاتی۔

دادی کے ارد گرد کئی دادیاں آ کھڑی ہوتیں۔۔۔

''کون؟''

''وہی اپنی کیسری، اور کون۔۔۔؟''

کیسری، دادی کے کچے کنوارے دنوں کی سہیلی تھی۔ بڑے پیارے پکے رنگ میں ڈھلی تھی اور بے تحاشا کوکنے کے انداز میں باتیں کیے جاتی تھی۔۔۔

''تمھیں تو بھگوان نے بے خیالی میں لڑکی بنا دیا، کیسری''، دادی اپنی سہیلی سے کہا کرتی تھی۔

''دیکھنا، کسی دن اچانک تمھارے پر نکل آئیں گے اور تم کوئل بن کر اُڑتی پھرو گی۔''

دادی کی شادی سے پہلے ہی کیسری پھرّ سے اڑ کر ساتویں آسمان میں جا پہنچی تھی۔ سہاگ کے بھرے پُرے دنوں میں دادی کا اس کی طرف دھیان ہی نہ گیا مگر اپنے ان آخری دنوں میں ایک رات کو کیسری اچانک آپ ہی آپ آکاش سے اتر کر اس کے آنگن میں لگے آم کے پیڑ پر آ بیٹھی اور اپنے کنوارے پن کی کوکیں دینے لگی۔ یہ کوکیں سُن کر دادی کی گری پڑی ساعتیں یک لخت کھڑی ہو کر اپنے بابل کے گاؤں کی طرف سرپٹ بھاگنے لگیں۔

دادی کی کوٹھری میں ایک دو نے نہیں، بیسیوں چڑیوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔۔۔ چوں۔۔ چوں چو۔۔۔۔چ۔۔۔۔!

''یہ ماننے والی بات نہیں، دادی ذرا بیٹھ جاؤ۔''

''مگر دادی،—— یہ باتونی چھوکریاں ذرا کی ذرا میں اٹھنے کہاں دیں گی۔ دادی بیٹھ جاتی۔ اری کوشلیا، تمھارا لونڈا اب کیسے ہے؟'' کوشلیا کا لونڈا اپنی ماں کا منہ کھلنے سے پہلے گھونسلے سے پھدک کر نیچے آ جاتا ہے۔

''میں اب بالکل ٹھیک ہوں، دادی۔ دیکھو،——'' وہ ایک جھپاکے میں ساری چھت کی اڑان بھر کر دادی کو دکھاتا ہے۔

دادی کو معلوم تھا کہ سب سے پچھلی کوٹھری میں ایک نہایت بوڑھے ناگ نے قیام کیا ہوا ہے۔ اپنی ڈولی سسرال میں پہنچنے کے دوسرے ہی روز اس نے ناگ کو یہاں سے اپنے بل کے پاس کنڈلی مار کر سوئے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اسے دیکھتے ہی سہم کر اس کے من سے چیخ نکل گئی تھی۔

اس کی چیخ سُن کر اس کی ساس دوڑتی ہوئی چلی آئی تھی۔ ''کیا ہوا، بہورانی۔۔۔؟'' اور پھر ناگ کو دیکھ، اس کی ساس رانی نے جھٹ سے اپنے دوپٹے کو منہ پر گرا لیا تھا۔ اس نے، اسے بھی کہا تھا کہ گھونگھٹ نکال لے۔۔۔

''یہ تمھارے سسر کے دادو ہیں، بہورانی۔ تم سے ملنے کے لیے باہر آئے ہوئے ہیں، پرنام کرو۔۔۔''

جب ساس بہو گھونگھٹوں میں منہ چھپائے ناگ منی کو پرنام کر رہی تھیں تو وہ دادی کی چیخ سے جاگ کر اب ان کی جانب پھن پھلا کے کھڑا ہو چکا تھا۔ کہنے لگا:

''جیتی رہو، بہورانی، دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔۔۔!''

دادی کا معمول تھا کہ ہر رات کو سونے سے پہلے وہ کٹوری میں دودھ بھر کر ناگ کے بل کے قریب رکھ آتی اور صبح کو خالی کٹوری وہاں سے اٹھا لاتی۔

دادی اکیلی تو نہ تھی مگر پھر بھی کبھی کبھی اس کا جی بھر آتا اور وہ غوطے کھا کھا کر سوچتی کہ وہ سارے لوگ کن بھول بھلیوں میں کھو گئے۔ ایک دفعہ جو گئے تو پھر کبھی منہ نہ دکھایا۔ ساون کے مہینے میں جب سن رسیدہ گھر کی چھتیں ٹپک رہی ہوتیں تو وہ بول اٹھتی۔

''دیکھ رہی ہو دادی، اپنا یہی ایک پُرکھا تھا جو ابھی جوں کا توں کھڑا تھا، اب یہ بھی پھوٹ پھوٹ رونے لگا ہے۔''

دادی جب اندھی سرعت میں کوٹھڑیوں کے برآمدے کی دو سیڑھیوں سے آنگن میں اترنے لگی تو اس کا پیر ایک سیڑھی کو چھوڑ کر دوسرے کے سرے پر پڑا اور وہ اوندھے منہ آنگن کے کچے فرش پر آ گری اور آخری دم لینے سے پہلے یہی سوچتی رہ گئی کہ ہانڈی تو جل کر کوئلہ ہو چکی ہو گی۔

گھر کا بوسیدہ دروازہ دو چار جھٹکوں میں نیچے آ گرا اور اس کے ساتھ ہی دادی کا پوتا بھی ۔۔۔ وہ ابھی سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ دادی کے بڑے سسر راجہ نے پھنکارتے ہوئے اس کا استقبال کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے کہیں غائب ہو گئے۔ وہ اپنے حواس کو اکٹھا کرنے کا جتن کرنے لگا مگر آنگن میں قدم دھرتے ہی پتھرا کر رہ گیا۔

پورے چاند کی روشنی میں دادی کی لاش کو دادیاں ہی دادیاں گھیرے ہوئے تھیں ۔۔۔

('دادیاں' جوگندر پال)

اس کہانی میں دادی بالکل تنہا ہے۔ اس کا اپنی گزرتی زندگی سے تعلق نہ ہونے کے برابر ہے۔ جب حقیقی زندگی سے تعلق نہ رہا تو دادی نے تصوّرات کی دنیا میں جینا شروع کر دیا۔ یہ تصوّرات مجرد ہیولوں کی صورت کبھی اس کی الھڑ پنے کی سہیلی کی شکل میں اس کے پاس آتے ہیں تو کبھی چڑیوں کے بچوں کی صورت اس کا دل بہلاتے ہیں۔ ناگ منی دراصل اس تاریخی تجرید کی علامت ہے جو اسے گزرے وقتوں کے ساتھ جوڑتا ہے۔

دادی جس تجریدی/خیالی دنیا میں زندہ رہ رہی تھی، وہ اسے تاریخی ورثے کے طور پر ملی۔ دادی کی طرح ہر فرد کسی نہ کسی طور اسی تاریخی تجرید کا حصہ ہے۔ ہر نیا آنے والا، ایک وسیع تر تربیتی نظام میں سے گزارا جاتا ہے تاکہ وہ ان تجریدی تصورات کا حصہ بن جائے۔

تصوّریت/تجرید (Abstraction) کے کئی پہلو ہیں۔ یہ پہلو کسی نہ کسی طرح ہماری زندگی کے اکثر پہلوؤں سے منسلک رہتے ہیں۔ تجرید، دراصل انسان میں موجود قوّتِ متخیلہ (Power of Imagination) میں وجود پاتی ہے۔ سوچنے کے عمل میں یہی قوت بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ مثال

کے طور پر آپ کسی پہاڑی مقام کی سیر کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ آپ نے اس سے پہلے پہاڑی علاقے نہیں دیکھے۔ آپ کے پاس پہاڑی علاقوں سے متعلق جو بھی معلومات ہیں، وہ آپ نے کتابوں میں پڑھی ہیں یا ایک دستاویزی فلم سے حاصل کی ہیں۔ انہی معلومات کی بنیاد پر آپ پہاڑی علاقے کی اونچائی، موسمی حالات، رہنے کی سہولیات اور سیر سپاٹے کے بارے میں منصوبہ بندی کریں گے۔ آپ اپنے تخیل کی مدد سے انہی معلومات میں ادل بدل کر کے اپنا سفری پروگرام ترتیب دیتے ہیں۔ تخیل میں معلومات کی الٹ پھیر ہی، دراصل سوچنے کا عمل ہے۔

ایجادات، نئے خیالات اور نئی سرگرمیوں کے پیچھے بھی بنیادی محرک، قوت متخیلہ ہی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر پہیے کی ایجاد کو ہی لیں۔ کسی شخص نے گول سطح والے درخت کے تنے کو ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اپنے تجربات اور مشاہدات کے حوالے سے نتیجہ نکالا کہ صرف گول سطح والے تنے یا پتھر ہی لڑھکتے ہیں، چپٹی اشیا نہیں لڑھکتیں۔ اس نے اپنے تخیل میں انھی معلومات کو ایک دوسرے سے ملا کر مفروضے (Hypothesis) بنانا شروع کیے۔ اپنے تخیل میں انھی مفروضوں کے، ممکنہ نتائج کی تصویر بنائی۔ اس نے لیور کی مدد سے پتھر کو اٹھا کر، اس کے نیچے گول تنے رکھ دیے۔ انھیں دھکیلا اور یہ آسانی سے حرکت کرنے لگے۔ یہ نیا مشاہدہ تھا۔ اسی کی بنیاد پر اس نے گول تنے کے دو ٹکڑے کاٹے اور انھیں ایک لٹھ کے ساتھ جوڑ دیا۔ پتھر کو لٹھ کے اوپر رکھا اور اسے دھکیلا۔ یہ گول تنوں کے تجربے سے بہتر تجربہ تھا۔ اسی طرح تجربات (Experiments) / مشاہدات (Observations) سے ملنے والی معلومات میں قوّت متخیلہ کی مدد سے ردوبدل کے ذریعہ نئے امکانات (Possibilities) پیدا ہوئے —— یہی سائنسی ایجادات کا بنیادی طریقہ اور عمل ہے۔

یہی نہیں ہم اپنی روزمرہ زندگی میں بھی معمولی سے معمولی کام اپنی قوّت متخیلہ کی مدد سے بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کسی لڑکی کو پسند کرتے ہیں۔ آپ اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ آپ کے ساتھ پڑھتی ہے۔ آپ کا تعلق ایک دیہاتی علاقے کے غریب خاندان سے ہے اور وہ شہر کے متوسط خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ آپ کے ذاتی مشاہدے اور اس کے بارے میں

جو معلومات جمع ہوئیں ان سے نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ لڑکی بڑی حساس، ذہین، پیار کرنے والی اور سب سے اہم یہ کہ خوش شکل بھی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ آپ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ مل بیٹھنے اور باتیں کرنے میں مزا آتا ہے۔ کچھ ماہ کے بعد آپ کو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کی شخصی خوبیوں کی بجائے گاڑیوں اور قیمتی اشیا کے بارے میں بڑے اصرار کے ساتھ گفتگو کرتی ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ انسانی تعلق میں چیزوں کا عنصر ایسی اہمیت نہیں رکھتا۔ آپ کو اس خاتون کے بارے میں جو معلومات ہیں ان کی مدد سے آپ کی قوت متخلیہ ایک ایسی شخصیت کا پیکر تراشتی ہے۔ آپ ان کے آپسی تعلق اور ممکنہ امکانات کے بارے میں سوچتے ہیں۔ آپ کو اندازہ ہوتا ہے کہ شاید وہ خاتون آپ کی اچھی دوست اور ہم جماعت تو ہے مگر اچھی جیون ساتھی نہ بن سکے۔ چنانچہ آپ اس سے دوستی کے تو خواہاں رہیں گے مگر دیگر امکانات کو ترک کر دیں گے۔

جب صورت حال بہت پیچیدہ ہو اور اس میں معلومات بہت زیادہ یا وسیع ہوں تو ایسے میں تجرید کی مدد سے اسے آسان بنا کر سمجھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر فطرت کے پیچیدہ نظام کے باہمی تعلقات کو سمجھنے کے لیے الجبرا اور ریاضی کی ضرورت پڑی۔ انہی علوم کی مدد سے پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے میں آسانی پیدا ہوئی۔ جب سے سائنسی تحقیق کو ریاضی اور الجبرے سے منسلک کیا گیا، زندگی اور فطرت کو سمجھنے، امکانات میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی۔ جیومیٹری خلا (Space) میں مختلف اجسام کی حیثیت اور آپسی تعلق کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ جیومیٹری کی اشکال اور نقشہ جات، دراصل کسی بھی جگہ یا صورت حال کی تجرید ہوتے ہیں۔

تجرید کے عمل کی بنیاد اگر ٹھوس حقائق اور معلومات پر ہو تو اس سے ٹھوس نتائج نکلتے ہیں۔ بعض اوقات ٹھوس حقائق کی زنجیر میں کوئی کڑی واضح نہیں ہوتی تو قیاس آرائی کر کے محض مفروضوں سے اس خالی جگہ کو پُر کر لیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر قدیم دور میں کسان کی کھیتی کا انحصار بارش پر تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آسمان پر بادل آئیں تو بارش برستی ہے۔ کسان نے زمین تیار کی، اس میں بیج ڈالا۔ اب اس کی خواہش تھی کہ بادل آئیں اور کھیت پر پانی برسے۔ بادلوں کو لانے اور پھر کھیت پر انھیں برسانے کا

کسان کے پاس کوئی اختیار نہیں تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ بادل کہاں سے آتے ہیں۔ ہاں، اگر اسے قطعی طور پر بارشوں کے موسم کے بارے میں معلوم ہوتا تو بھی معاملہ ٹھیک تھا۔ وہ اس موسم سے پہلے کھیت میں بیج ڈال سکتا تھا۔ اسی طرح انسان، خود اپنے مادی جسم، بیماری، موت اور پیدائش کے معاملات پر پریشان ہوتا تھا۔

شعور کے اس ابتدائی دور میں بھی یہ بات انسان کو معلوم تھی کہ ہر واقعے کے پیچھے اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ وجہ تلاش کرنے کے لیے مشاہدات محدود تھے۔ مثال کے طور پر بیماری کی وجہ جراثیم تھے مگر ان کے مشاہدے کے لیے انسان کو خوردبین کی ایجاد تک انتظار کرنا پڑا۔ اس سے پہلے ان کی وجوہات کی خالی جگہ کو مختلف تجریدی تصوّرات سے پُر کیا گیا۔ مثلاً یہ کہ کچھ روحیں، آسیب یا چڑیلیں وغیرہ جسم میں اتر کر جسم کی عمومی حالت کو اتھل پتھل کر دیتی ہیں۔ ظاہر ہے یہ بیماری کا تصور وہ نہ تھا جو جراثیم کے انکشاف کے بعد پیدا ہوا۔

کچھ لوگ جو موثر قوت متخیلہ کے مالک تھے، انھوں نے معمولاتِ زندگی میں پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات فرضی کہانیوں سے گھڑ لیے۔ یہ تاریخ کے ایک خاص دَور تک معلوم حقائق کے عین مطابق اور لوگوں کے لیے تشفی بخش تھے۔ مثلاً یہ کہ بارش برسانے کا ذمے دار آسمانوں پر بیٹھا ایک دیوتا ہے۔

سوالوں کے جواب دینے والا شخص اس لحاظ سے معتبر ہو گیا کہ اس نے سوالوں کے جواب ڈھونڈے۔ اس کی حیثیت سوال کرنے والے سے ارفع قرار پائی۔ تاریخ کے اسی مرحلے پر لوگوں کے سوالات کے جواب دینے کے لیے ایک گروہ پیدا ہو گیا۔ یہ گروہ ایسے مفروضے قائم کرتا جو اگرچہ حقیقی صورت حال سے کسی طور متعلق تو تھے مگر ان کا تعلق زندگی کے ان گوشوں سے تھا، جن کی اس دور میں وجہ تلاش کرنا ممکن نہ تھا۔ مقدّس خیالات اور مقدس گروہ، جن کا ذکر پہلے ہو چکا، کی اساس بھی انھی مفروضوں پر تھی۔ اِنھیں مقدّس مفروضوں کی بنیاد پر مخصوص قسم کے شعوری نظام (مذاہب) استوار ہوئے۔

قدیم انسان کا اپنے، اپنے اردگرد بستے لوگوں اور قدرت سے متعلق شعور اس طرح کا نہ تھا جس طرح کا شعور ہم رکھتے ہیں۔ اس کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر 'اگر کوئی قدیم انسان غار میں ایک بھیڑ کی تصویر بناتا تھا تو وہ اس نقش کو محض تصویر ہی نہ سمجھتا تھا بلکہ درحقیقت اپنے ریوڑ میں ایک بھیڑ کا اضافہ تصوّر کرتا تھا'۔ (Hauser. A. 1984 P.4) اس کے نزدیک کوئی بھی نقش (Image) یا خیال محض ایک نقش یا خیال نہ تھا بلکہ حقیقت میں بھی ایک وجود رکھتا تھا۔ مثال کے طور پر اگر اسے خواب میں اپنا کوئی مرا ہوا بزرگ نظر آتا تو وہ سمجھتا کہ یہ بزرگ جسمانی طور پر نہ سہی، کسی اور روپ میں اس کے اردگرد ہی موجود ہے۔ یعنی خواب کی کیفیات اس کے لیے حقیقی روپ رکھتی تھیں۔ اگر ذہنی ہیجان کے باعث اسے بدہیئت شکلیں نظر آتیں تو وہ ان کو بھی حقیقی روپ میں محسوس کرتا۔ زمین سے پودے کا اگنا، قدیم انسان کے لیے ایک معمہ تھا۔ سورج کا ایک زمانی ترتیب سے نکلنا، موسموں کی تبدیلی —— سب تجربات کی واضح وجوہ نہ ملنے کے باعث قدیم انسان نے ان کے پیچھے محرکات سے متعلق مفروضات گھڑ لیے۔ یہ مفروضات محض خیالات کی طرح عدم وجود کے حامل نہ تھے بلکہ ان کو سچائی کا عکس مانا جاتا تھا۔ اس طرح اشیا، مظاہر، ذہنی کیفیات اور ان میں فرد کی حیثیت (Status) کے مطابق مختلف خیالات پیدا ہوئے۔ دیوتا، دیوی، جن، بھوت، چھل پیری اور اسی طرح کے دیگر تصورات پیدا ہوئے۔' ان تصورات کو محض خیال (Idea) نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ ان کی تجسیم (Embodiment) بھی کر دی گئی۔ یعنی یہ کہ ان تصوّرات کی خصوصیات کے مطابق، ہستیوں کے وجود کو ایجاد کر لیا گیا'۔ (Jung C. 1946 P.42)

قدیم انسان مختلف کیفیات کا مشاہدہ اور ان کے باہمی ربط کو سمجھتا تھا۔ اسی باہمی ربط کی بنیاد پر وہ نتیجہ نکالتا اور مختلف تصوّرات کو جنم دیتا تھا۔ مثال کے طور پر زمین میں بیج ڈالیں تو، زمین انھیں اُگاتی ہے، انھیں پالتی ہے اور پھر ان کی افزائش کرتی ہے۔ قدیم انسان کو زمین اور ماں کے درمیان مماثلت نظر آئی اور ماں کے ساتھ ساتھ زمین بھی ماں کا رتبہ (Mother Earth) حاصل کر گئی۔

قدیم انسان، اپنے شعور کے مطابق حقیقتِ حال سے قطعی طور پر نہ تو صرفِ نظر کرتا تھا اور نہ ہی

ان میں اپنی غرض کی خاطر الجھاؤ پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ فطرت کے جاری عمل میں اپنے مفاد کے لیے جگہ تلاش کرتا تھا۔ اسی بنا پر اس نے زرعی پیداوار کی اہلیت، ضروری اصول اور آلات بنائے۔ ان اعمال میں بعض مقامات پر باہمی ربط اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ بعض حادثات و واقعات کی زندگی میں معنویت کو سمجھو نہ پاتا۔ جیسے موت کا زندگی سے رشتہ واضح نہ تھا۔ چنانچہ وہ اس خالی جگہ کو پُر کرنے کے لیے مختلف خیالات بناتا۔ مثال کے طور پر جس جگہ پر درخت کے نیچے مرنے سے پہلے اس کا باپ بیٹھا کرتا تھا، اس درخت کے ساتھ باپ کی روح کی نسبت طے کر دی گئی۔ اس طرح مرنے والے بزرگوں سے تعلق قائم رکھنے کے لیے ارواح کا سلسلہ قائم کیا گیا۔

جب ریاست وجود میں آئی تو تقدیس پیدا کرنے والے گروہ نے پہلے سے موجود خیالات کو ایک وسیع تر سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس وسیع تر سانچے میں پہلے سے موجود تمام محرکات کو وحدت دے دی گئی۔ فطرت، انسان اور ارتقا سے متعلق تمام معاملات کو ایک اعلیٰ قدر (Supreme Value) کی صورت دے دی گئی (Jung)۔ ان محدود علاقائی یا قبائلی خیالات و تصورات کی جگہ ایک وسیع تر تصور نے لے لی۔ اس تصور کو مرکزی اور ارفع حیثیت دے کر اس کی بنیاد پر ایک وسیع تر شعوری نظام کی تشکیل کر دی گئی۔ اسی شعوری نظام سے مختلف مذاہب پیدا ہوئے۔ واضح رہے کہ ان مذاہب میں تصورات کو مجسم صورت دے کر اعلیٰ و ادنیٰ ہستیوں میں تبدیل کر دیا۔

اس نئے شعوری نظام کی بنیاد، اساسی طور پر تجرید برائے تجرید (Abstraction for Abstraction Sake) پر تھی۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے تجرید، ٹھوس زمینی حقائق اور علت و معلول (Cause and Effect) پر قائم تھی۔ اس نئے تجریدی نظام میں ایک تجرید دوسری تجرید کو نہ صرف جنم دیتی تھی بلکہ ایک وسیع نظام کو تشکیل دے کر لوگوں کو اس پر یقین کرنے پر آمادہ کرتی تھی۔ تجرید اگرچہ اپنی جگہ پر ٹھوس حقائق میں پیوست نہ تھی البتہ یقین زندگی کا حصہ بن کر، انسانوں کی زندگی اور شعوری سطح میں ایسی تبدیلی ضرور لاتا تھا جس کے تحت لوگ ریاستی ڈھانچے میں ایک اسیر کے طور پر بندھ گئے۔ یہ شعور بنیادی طور پر اسیری کا شعور تھا اور اس کے لیے ایک وسیع تر آسمانی نظام قائم کر دیا

گیا تھا۔ آسمانی نظام تجریدی واہموں اور خیالات پر مبنی تھا مگر اس پر یقین کر لینے کے بعد کوئی بھی فرد بادشاہی نظام حاکمیت کا اسیر ہو جاتا تھا۔ اس لیے کہ وہ اسے بھی آسمانی نظام کا ایک حصہ سمجھتا تھا۔

وسیع تر آسمانی نظام میں مرکزی حیثیت جس خیال کو تھی، لوگوں نے اسے تجسیم دے کر ایک ذات(Being) کی حیثیت پر کھڑا کر دیا۔ اس ذات کی صفات بعینہ وہی تھی جو ایک بادشاہ کی ذات سے منسوب تھیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ بادشاہ ماورا(Transcendent) ہونے کے ساتھ ساتھ قریب(Immanent) بھی ہے۔ بادشاہ، ریاست میں اس ذات کی طرح ہی اصلی محرک Basic) Value and Reason) ہے اور وہی ہر کام اور ہر شعوری قدر کی بنیاد ہے۔ اسی طرح جس طرح کائنات کی وجہِ اولیٰ اور بنیادی قدر ذاتِ اعلیٰ(Supreme Being) ہے۔

مخصوص شعوری نظام میں مفروض ذات اعلیٰ پر یقین سے ایک فرد خود بخود کسی قسم کی بھی حاکمیت اور تحکم کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو سکتا تھا کیونکہ اس یقین کے پس پردہ حقیقی حاکمیت تو بادشاہ کی ذات ہی تھی۔

اس شعوری نظام میں تجریدی تصوّرات کا ایک نظام استوار کیا گیا۔ ان پر یقین کے بعد انسان کی قوتوں اور ذہنی صلاحیتوں کو قید کر دیا گیا۔ اس نظام کی پہرہ داری دراصل شیطان کا وسوسہ یا بہلاوا قرار دے دیا گیا۔ شیطان کے بہلاوے کو گناہ اور خلش کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا۔ اس طرح شیطان کے تصوّر کی بدولت اس شعوری نظام کی خود حفاظتی کا بندوبست ممکن ہو گیا(Jung)۔

بظاہر تجرید کا یہ شعوری نظام اپنی ساخت کے اعتبار سے انسانی زندگی میں ٹھوس جڑیں نہیں رکھتا تھا مگر جب انسانوں نے اس پر یقین کر لیا تو یہ ایک حقیقت بن گیا۔ اسی حقیقت کے تناظر میں اس کا انسانی زندگی پر اثر ٹھوس صورت میں ظاہر ہونے لگا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص سخت محتاجی کی زندگی گزار رہا ہے۔ اس کے لیے اس زندگی سے فرار یا بہتری کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر وہ شخص یہ یقین کر لے کہ اس کی موجودہ زندگی کے مصائب دراصل اس کا امتحان ہے اور اس کے بدلے اسے مرنے کے بعد ایک شاندار زندگی اور بے پناہ مسرّتیں ملیں گی، تو وہ شخص بڑے صبر کے ساتھ جاری ذلّتیں برداشت

کر لے گا۔ مرنے کے بعد اسے شاندار زندگی ملے یا نہ ملے، اس زندگی میں اس کے محتاج رہنے کا فائدہ براہ راست اس وقت کے حکمرانوں کو ضرور مل جائے گا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص یہ مان لے کہ اگر وہ اپنی جان اس اعلیٰ ہستی کے نام پر لڑائی میں لڑتے ہوئے دے دے تو اسے مرنے کے بعد بہت بڑا رتبہ ملے گا۔ حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ اکثر صورتوں میں جنگیں حکمران اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے لیے لڑتے رہے ہیں تو گویا اس نے جان دے کر اس بادشاہ کے عزائم پورے کیے۔ ایسے تصوّرات پر یقین کی بدولت انسانی تاریخ میں کروڑوں انسانوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا۔ جن کا براہ راست فائدہ، مفاد پرستوں کو ہی ملا۔

تجرید پر یقین میں اتنی صلاحیت ہے کہ کوئی بھی فرد ایک جیتا جاگتا، بااختیار انسان رہنے کی بجائے، اپنے آپ کو بھی ایک تجرید کے طور پر محسوس کرنے لگتا ہے۔ ارد گرد بسے لوگوں اور ٹھوس حقائق کو اسی تجرید میں رکھ کر دیکھتا اور محسوس کر سکتا ہے۔ خود اس کا جسم جو ایک جیتی جاگتی ہستی ہے، اسے ایک تجرید محسوس ہونے لگتا ہے۔ مجرّد معاشروں میں انسانوں کی تقسیم اور ان کا کردار اسی تجرید کی بنیاد پر طے ہوتا ہے۔ اسی کے تحت تحکّم(Authority) کی درجہ بدرجہ تقسیم ہوتی ہے۔

II

تجرید کی ایک صورت واہموں(Illusions) پر یقین ہے۔ اس یقین کی بدولت کوئی بھی فرد سخت دقّت طلب حالات میں بھی نہ صرف اپنی جان لڑاتا رہتا ہے بلکہ اسے اپنی برّیت، زندگی کا مقصد اور اس کے حصول کا ذریعہ مان لیتا ہے۔

مثال کے طور پر Life is beautiful، ایک اطالوی فلم کی کہانی ملاحظہ کریں۔ یہ فلم اٹلی میں فاشسزم کے پس منظر میں بنائی گئی ہے۔ فلم کے بنیادی کردار میاں بیوی اور ان کا سات آٹھ سال کا لڑکا ہے۔ یہ سب ایک شہر میں سادہ سی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی زندگی میں آسانیاں تو نہیں البتہ اپنی محدود آمدنی میں وہ بخوبی گزارہ کر رہے ہیں۔ ان حالات میں وہ خوش رہتے ہیں۔ ہنستے کھیلتے زندگی گزار رہے ہیں۔ اچانک ایک روز دونوں میاں بیوی کو محض اس لیے گرفتار کر لیا جاتا ہے کہ وہ فاشسزم

کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ بیوی اور خاوند کو الگ الگ جیلوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ بچہ، باپ کے ساتھ جیل میں رہنا شروع کر دیتا ہے۔ بچہ اس نئی صورت حال میں سخت پریشان رہنے لگتا ہے۔ ماں سے بچھڑنا، ہر وقت سہمے ہوئے لوگوں میں رہنا، مار پیٹ اور تشدّد —— بچے کا دل ہر وقت دہلا رہتا ہے۔ وہ اس ساری صورت حال کے بارے میں باپ سے پوچھتا ہے۔ باپ، بچے کو سمجھاتا ہے بلکہ اسے یقین کرواتا (Make Believe) ہے کہ اُس عقوبت خانے میں جہاں وہ رہ رہے ہیں، دراصل ایک کھیل چل رہا ہے۔ اس کھیل میں ہر شخص کو لازماً دکھ جھیلنا ہے۔ جو شخص جتنے زیادہ دکھ اٹھائے گا، اسے اتنے ہی زیادہ نمبر ملیں گے۔ سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے کو کھیل کے خاتمے پر ایک ٹینک انعام میں ملے گا۔

بچہ، باپ کی اس کہانی پر یقین کر لیتا ہے۔ اس یقین کے بعد، بچہ اپنے اردگرد ہونے والے تمام تر مصائب اور تکالیف کو باپ کی سنائی کہانی کے تناظر میں پرکھنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کا باپ اس کی نظروں کے سامنے ذلّت آمیز اذیتیں سہتا ہے۔ مگر وہ ہر وقت ڈھیٹ بنا، مسکراتا اور بچے کو کھیل والی بات یاد دلاتا رہتا ہے۔ آخر کار بچے کے باپ کو قتل کر دیا جاتا ہے۔

بچہ باپ کو ڈھونڈتا، جیل کی بھول بھلیوں سے گزرتا ہوا، ایک سڑک پر آ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ خوشی سے پاگل ہو جاتا ہے کہ اس کے سامنے ٹینک چلے آ رہے ہیں۔ وہ ایک ٹینک کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ ٹینک رک جاتا ہے۔ ٹینک سے ایک سپاہی نیچے اترتا ہے اور بچے کو اٹھا کر ٹینک پر بٹھا دیتا ہے۔ بچہ یہی سمجھتا ہے کہ اس کے باپ نے جیل میں موجود لوگوں میں سب سے زیادہ دُکھ اٹھائے۔ اس کو سب سے زیادہ نمبر ملے اور نتیجے میں اسے ٹینک انعام کے طور پر مل گیا۔

یہ درست ہے کہ اس کہانی میں بچے کو واہمے (Illusion) پر یقین کر لینے کے بعد اپنے اردگرد کی صورت حال اس طرح نہیں لگ رہی تھی، جیسے کہ دراصل وہ تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس صورت حال میں اس کا باپ مارا گیا۔ اس کی ماں اسی جیل میں، اس سے دور سڑتی رہی۔ اور پھر جو انعام بھی ملا، وہ بھی واہمہ تھا۔ دراصل وہ اتحادی فوجیوں کا ٹینک تھا جو جنگ کے خاتمے کے بعد شہر میں گشت کر

رہے تھے۔

سوال یہ ہے کہ کیا واہموں کو حقیقی صورت حال سے فرار کا ذریعہ مان لینا درست ہے؟ کیا درد کا احساس کم کرنے والی دوا، اصل مرض کا علاج ہو سکتی ہے؟ دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسانوں کو مخصوص کردار نبھانے کے لیے اگر واہموں کا اسیر بنا دیا جائے تو کیا یہ واہمے انسان کے دوست ہو سکتے ہیں؟

تاریخی طور پر ہمارا معاشرہ اوپر کی سطح پر بیٹھے اقلیتی گروہ کے مقاصد کے تحت بنا۔ اسی کے تحت معاشرے کی ادنیٰ ترین اکائیاں بنیں سنوریں۔ اوپر سے نیچے تک تجرید اور واہموں کے زیرِ اثر شخصیات اور رشتوں کو باندھ دیا گیا۔

بادشاہ اپنی حکومت کا جواز اس بات پر رکھتا تھا کہ اسے خدا نے زمین پر اپنے نائب کے طور پر بھیجا ہے۔ یہی بات اس کے اقتدار کو سیاسی جواز مہیا کرتی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس جواز کی شہادت کس طرح حاصل کی جائے؟ 'خدا' نے اسے یہ پیغام کیسے دیا؟ بادشاہ نے اس کی تصدیق، اس گروہ سے کروائی جو اپنے آپ کو خدائی نظام کا سرپرست سمجھتا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ سرپرستی کی سند انھیں کیونکر عطا ہوئی؟ دراصل تو یہ ایک واہمہ تھا اور اس کے درپردہ بادشاہوں یا حکمرانوں کو جواز فراہم کرنا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ لوگوں کو اس تصوّرِ اعلیٰ (Supreme Idea) پر اس قدر تواتر سے یقین دلا دیا گیا تھا کہ آخر وہ ہستیِ اعلیٰ (Supreme Being) بن گیا۔ چنانچہ لوگوں کے لیے اس پر اقرار کے سوا کوئی اور گنجائش ہی نہ تھی۔

بادشاہ/حکمران کا اقتدار اپنی ٹھوس حیثیت میں خوف پیدا کر لینے کی طاقت، سزا اور جزا دینے کی صلاحیت اور واہموں کی مدد سے مافوق الانسان بن جانے پر مبنی تھا۔ انھی عناصر کو یقین کی صورت لوگوں میں ڈھالنے کے لیے ایسی کہانیاں اور ضرب الامثال گھڑی گئیں جن میں ایک عام فرد کی فرمانبرداری اور محتاجی ثابت ہوتی تھی اور بادشاہ کے رعب، دبدبے، قہاریت اور سب سے بڑھ کر اس کا عام انسانوں سے بلند اور ماورا ہونا ثابت ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر یہ کہ بادشاہ جسے چاہے عزت اور جسے چاہے ذلت دے سکتا ہے۔ بادشاہ کے لیے رعایا اس کے بچوں جیسی ہوتی ہے اور بادشاہ کے عدل کے

قصے وغیرہ وغیرہ۔ اصل معاملہ یہ تھا کہ بادشاہ ان واہموں کی بدولت ہی اپنی گرفت کو لوگوں کے شعور پر کستا تھا اور لوگ اسی شعور کے تحت بادشاہ کے اصلی چہرے سے صرفِ نظر کر لیتے تھے۔ بادشاہ کا اصل چہرہ اور اس کی حاکمیت کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ لوگ پیداوار کے ذرائع اور پیداوار اُس کے حوالے کرنے پر تیار ہوں۔ لوگ اس ظلم کو ایک فرض کے طور پر مان لیتے تھے۔

جدید ریاستی نظام میں ووٹ، نمائندگی، الیکشن، پارلیمنٹ اور قانون کی حکمرانی دراصل واہموں کی نئی صورتیں ہیں۔ اس نظام میں یہ تأثر دیا جاتا ہے کہ حکمرانی دراصل عوام کی ہے مگر ریاستی دولت اور اختیار میں ان کی نمائندگی شامل نہیں کی جاتی۔ صرف ایک تأثر قائم کیا جاتا ہے کہ جس میں عوام کی وسیع نمائندگی اور ان کے مفادات کے تحفظ کا اشارہ ملے۔

طاقت اور تحکم کی بنیاد پر بننے والے معاشروں میں تمام رشتوں کو واہموں کی 'مقدس تقسیم' میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ یہی واہمے اور ان کی پاسداری زندگی کا مقصد ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر عورت کی ذات اور کردار کی مناسبت سے واہموں پر غور کریں:

'عورت محض جنسی تسکین کا ذریعہ اور اس لحاظ سے ایک شے کا رتبہ رکھتی ہے۔'

'عورت مجہول (Passive) اور مرد کی حکمرانی کے تحت محض باندی کا رتبہ رکھتی ہے۔'

'عورت کے لیے لازم ہے کہ وہ یہ فرائض وفاداری سے انجام دے۔ اگر وہ وفاداری سے تمام تر ذلتیں سہہ لے تو جنت اس کے قدموں میں چلی جائے گی۔'

عورت انھی واہموں کی پاسداری میں اپنی زندگی گزار دیتی ہے اور اس طرح مرد کی حاکمیت میں پنپنے والا کنبہ دراصل وسیع تر ریاستی جبر اور حاکمیت کو قبول کر لینے والے افراد پیدا کرتا رہتا ہے۔

بچے سے منسوب واہموں کو لیں۔ فرمانبرداری (Submission)، مجہولیت (Passivity)، غیر مشروط محتاجی (Unconditional Dependence) اور مکمل وابستگی ایک اچھے بچے کے وصف ہیں۔

یہی نہیں، خاندان میں ہر رشتے، ماموں یا چاچا، خالہ، پھپھو، بیٹا، بیٹی، داماد، بہو، نانا نانی، دادا دادی، پوتے، نواسے سب کے سماجی کردار طے ہیں اور سب لوگ انھی کرداروں کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

کرداروں کے ساتھ ساتھ رویے اور سماجی ادارے بھی انھیں واہموں کے تناظر میں استوار ہوئے۔ جنسیت کی مثال لیں۔ انسانی صورت حال میں جنسیت (Sexuality) محض نسل بڑھانے کا وسیلہ نہیں، اس میں تسکینِ جاں کا بھی عنصر شامل ہے۔ جب انسانی زندگی میں ملکیت کا تصور آیا تو رشتوں میں نسبت (Belonging) کی بجائے ملکیت (Possession) کا تصور غالب ہو گیا۔ قدیم زمانے میں خاندان، عورت کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا۔ عورت ہی خاندان کی سربراہ ہوتی تھی اور وہی بچوں کی پرورش اور نگہبانی کرتی تھی۔ جب مرد کو یہ راز معلوم ہو گیا کہ وہ بھی بچے کی پیدائش میں حیاتیاتی طور پر شریک ہے تو کنبے کی حاکمیت مرد کے سپرد ہو گئی۔ چونکہ ذاتی ملکیت کی بنیاد انا کی توسیع (Extension of Ego) پر ہوتی ہے، اس لیے مرد نے اولاد کو اپنی ذات کی توسیع سمجھنا شروع کر دیا۔ اس طرح ملکیت کا تصور، عملی طور پر رشتوں کی شناخت میں شامل ہو گیا۔ کنبہ، اس میں شامل بیوی اور بچے، مرد کی ذاتی ملکیت متصوّر ہونے لگے۔ مرد نے اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ عورت اس کے نطفے سے ہی اولاد پیدا کرے، عورت کی سرگرمیوں کو شدید قیود میں بند کر دیا۔ اس دور میں چونکہ اولاد کی پیدائش کے جائز ہونے کا کوئی سائنسی ثبوت ملنا ممکن نہ تھا، عورت کے میل میلاپ کو ختم کر دیا گیا اور دوسرے مردوں کے ساتھ اس کا ملنا حرام قرار دے دیا گیا۔ یہی وہ طریقہ تھا، جس پر عمل کر کے اولاد کے جائز ہونے کو یقینی بنایا جا سکتا تھا۔ اسی صورت حال میں عورت کی پاکیزگی، دوشیزگی، چادر، پردہ، چاردیواری، جنسی ملاپ میں حرام، حلال، زناکاری اور عورت کی مرد کے سامنے ایک جنسی لونڈی جیسی حیثیت کے تصوّرات پیدا ہوئے۔ مرد اور عورت انسانی صورت حال میں ایک دوسرے کے شریک رہنے کی بجائے دو مختلف جہانوں میں تقسیم کر دیے گئے۔ اس کی بنیاد پر سماجی اخلاقیات یعنی معاشرے کی تنظیم ہوئی۔ انسانیت سیدھے سادھے طریقے پر دو حصوں میں بٹ گئی۔ عورت نے یہ غلامی اس لیے قبول کر لی، کیونکہ وہ اپنے فطری فرائض یعنی بچے کو پیدا کرنے اور اس

کی پرورش یعنی ممتا کے فرض سے بھاگ نہیں سکتی تھی(Simone)۔ یہ اس کا فطری کردار تو تھا مگر اسی کی بنیاد پر وہ مردوں کے معاشرے میں محتاج بنا دی گئی۔

گھریلو عورت کا فرض مرد کی نسل کو بڑھانا تھا اور اس سے مرد اور عورت کے مابین جو رشتہ بنا وہ تحکمانہ نظام کی نہ صرف بنیاد ٹھہرا بلکہ ایک سماجی مجبوری بن گیا۔ مجبوری کے رشتے میں قدرتی پن نہیں ہوسکتا تھا اور اس طرح جنسی ملاپ صرف بچے کی پیدائش کا ذریعہ ہی رہا۔ اس میں تسکینِ جاں کا عنصر نہ تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے طوائفوں اور جسم فروشی کا ادارہ قائم ہوا۔ اس میں مرد کی فطری تسکینِ جاں کا بندوبست تو تھا مگر اسے حد درجہ ناپسندیدہ قرار دے دیا گیا۔ واضح رہے کہ جنسیت کے فطری اُبال یا انگیخت کے زیرِ اثر کوئی بھی فرد سماجی یا ذاتی حدود و قیود سے الگ خود مختار ہوسکتا ہے۔ اس اُبال کے دوران کوئی بھی شخص اپنی فطرت کے بہت قریب چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنسی محبت (Sexual Love) کے اُبال کے زیرِ اثر کوئی شخص مرد ہو یا عورت، کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ چونکہ فطرت کے قریب آتے ہی رسمیت اور سماجی ضابطوں کو وارفتگی یا قدرتی پن (Spontaneity) کی ایک لہر توڑ پھوڑ سکتی ہے، جنسی آزادی اور جنسی محبت کو ناجائز فعل قرار دے دیا گیا۔ اس کے لیے کڑی سزائیں مقرر کر دی گئیں۔ اس تناظر میں طوائفوں اور جسم فروشی کے ادارے کو سماج کی قبولیت تو حاصل ہے مگر انھیں مخصوص قیود میں بند کر دیا گیا۔ ان کے علاقے عام بستی سے علحدہ رکھے گئے تاکہ عام لوگ اس سے محفوظ رہیں۔ اس طرح طوائف، مردوں کے معاشرے میں طے کردہ ضابطوں کے تضادات کی تجسیم (Embodiment) بنتی ہے اور حد درجہ ناپسندیدہ بھی۔

طوائف کی طرح، ایک پاگل بھی سماجی رشتوں کے کڑے تضادات میں سے پیدا ہوتا ہے۔ پاگل پن کی سماجی وجوہات میں سب سے اہم، معاشرے میں رشتوں پر بے اعتباری اور فرد کا بالکل اکیلا ہونا، ہوسکتا ہے۔ وہی شخص پاگل ہوتا ہے جس میں احساس کی شدّت ہو اور وہ اس احساس کی وجہ سے اپنے اردگرد جاری صورت حال سے سمجھوتہ کرنے سے قاصر ہو جائے۔ اسے کوئی بھی فرار کی راہ یا صورت نظر نہ آئے۔ اُس شخص کو جو مروّجہ اسلوب پر اعتراض کرتا ہو یا انھیں انسانی دکھ کا باعث سمجھتا ہو، لوگ تنہا

کر دیتے ہیں۔ اگر فکری قوّت ہو تو اس تنہائی سے تبدیلی لانے والا ذہن نکلتا ہے یا پھر ایک پاگل۔ چونکہ ایک پاگل، اپنی ذات میں مروّجہ سماجی بودے پن پر احتجاج ہوتا ہے، اس لیے تحکمانہ نظام اپنے خود حفاظتی ڈھانچے کی مدد سے، اسے سماج کے دائرے سے باہر پھینک دیتا ہے۔ چونکہ وہ عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے، وہ عام لوگوں کی طرح زندگی نہیں گزار پاتا۔ اسے ایک عجوبے کے طور پر دیکھا جاتا ہے، اس کا مذاق اڑایا جاتا اور اسے عام لوگوں کے ساتھ سے بھی منع کر دیا جاتا ہے۔

انسان اپنی فطری صلاحیتوں میں سب سے اہم صلاحیت سوال کرنے اور اس کی بنیاد پر اپنے ماحول کو بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی صلاحیت اس کا حقیقی جوہر ہے۔ استحصالی معاشروں میں انسان کے جوہر کی نشوونما کی بجائے، اسے استحصالی مفادات کے تحت مخصوص کردار ادا کرنے تک محدود رکھا جاتا ہے۔ اس طرح اس کے حقیقی جوہر کی بجائے، کرداری خصوصیات کو ہی اس کی زندگی کا نصب العین قرار دے دیا جاتا ہے۔ چونکہ وہ کرداری خصوصیات، اس کے حقیقی جوہر سے متصادم ہوتی ہیں، اس لیے ان کے اردگرد واہموں کا ایک ہالہ بنا کر، ان پر یقین دلا کر، انھیں زندگی کا سب سے اہم مقصد قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہ عمل دراصل سدھانے کا ہی عمل ہے۔ چونکہ حتمی طور پر ایسے معاشروں میں انسانیت اور انسانی احترام اساسی طور پر موجود ہی نہیں ہوتا، سب لوگ مروجہ واہموں کے گھن چکر میں گرفتار، انھی واہموں کو ہی اصلیت مان لیتے ہیں۔ اس طرح سب مل کر انسان دشمنی اور انسانوں کو کھا جانے والے رویّوں کی نشوونما میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کی نشاندہی اس نظام میں رہنے والے سب سے کمزور گروہوں سے ہوتی ہے۔ پہلی سطح پر ایک اکثریتی آبادی مجبور ہو جاتی ہے۔ ان مجبوروں میں مرد پہلے درجے پر، عورتیں دوسرے اور سب سے نچلی سطح پر بچے آتے ہیں۔ مجبوری کی یہ تقسیم ہی نہیں، جب پیشہ ورانہ تقسیم کی جائے تو سب سے ادنیٰ سمجھا جانے والا گروہ مزید کہتری میں اتر جاتا ہے۔

III

تجرید، بنیادی طور پر کسی بھی کیفیت یا صورت حال کی پیچیدگی (Complexity) کو سمجھنے

کا ایک ذریعہ ہے۔ اس عمل میں پوری صورت حال یا اس کی نمائندہ جزئیات (Representative Details) کو علامتی طور پر سمجھنے سمجھانے کے عمل میں شامل کرلیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ سمجھنے سمجھانے کے عمل میں تجریدی علامت (Abstract Symbol)، اصل صورت حال کی نمائندہ تو ہوتی ہے مگر وہ اصل کا متبادل (Alternative) نہیں ہوتی۔ اسی طرح کسی بھی کیفیت یا صورت حال کا جزو (Part)، اصلی اور کلّی صورت حال (Totality) کا نمائندہ تو ہوسکتا ہے، اصل یعنی کُل کا متبادل نہیں ہوسکتا۔ مثال کے طور پر ایک بندر کو ناچنے کے لیے سدھایا جاسکتا ہے۔ یعنی یہ کہ بندر میں ناچ سیکھنے کی صلاحیت تو ہے مگر وہ اس کی مجموعی شخصیت اور صلاحیتوں کا متبادل نہیں۔ اگر ناچنے کو ہی اس کی صلاحیتوں کا حتمی نقطۂ عروج سمجھ لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کے وجود کی اوّل تو نفی کررہے، یا اس کی اصلیت کو اپنی ضرورت کے مطابق محض ناچنا ہی سمجھ رہے ہیں۔ ناچنے کو ہی بندر کی اصلیت سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ اس کے وجود کو ایک مجرد سانچے (Abstract Format) میں نہ ڈھال لیں۔ جب بندر کے وجود کو مجرد سطح پر مان لیا جائے تو وہ مداری کے لیے محض ناچنے والی شے ہوگا، جس سے روپیہ کمایا جاسکتا ہو۔ ایسے میں بندر کے جاندار ہونے، مارنے کی صورت میں اسے تکلیف اور اذیت کا احساس، نچانے والے کے لیے ختم ہوجائے گا۔ اس طرح بندر، نچانے والے کے نزدیک اپنی جاندار ہونے کی حیثیت کھودیتا ہے۔

اسی طرح کسی بھی انسان کو اس کی مجموعی انسانی خصوصیات سے الگ کرکے، مخصوص کرداری خصوصیات میں سدھانے سے پہلے اس کو ایک مجرد اکائی سمجھنا ضروری ہے۔ یعنی یہ کہ اس کی کسی ایک یا ایک سے زیادہ صلاحیتوں کو اس جیتے جاگتے، زندہ انسان کا متبادل سمجھ لیا جائے۔ مثال کے طور پر آقا کے لیے غلام کی جسمانی محنت ہی کارآمد خصوصیت ہے اور یہی خصوصیت غلام کے ایک مکمل انسان ہونے کا متبادل ہے۔ ایسی صورت حال میں غلام کی اپنی انسانی حیثیت کی نفی کرکے، اس کی ایک خصوصیت کو اس کا متبادل قرار دے دیا جاتا ہے۔ اسی طرح محنتِ جسمانی (Physical Labour)، غلام کی کلیت کا جزو تو ہے مگر اصلیت ہرگز نہیں۔ ایسے میں جب اس کی جزوی صلاحیتوں کو اصل مان لیا جائے تو دراصل غلام ایک مجرد اکائی کی سطح پر آجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آقاؤں میں غلاموں سے

متعلق تجرید کا شعور، انسانی احساس (Human Sensitivity) کی نفی کردیتا ہے۔ ان کی نظر صرف اور صرف غلام کی محنت پر مرتکز ہوتی ہے اور یہی ان کا مقصد ہوتا ہے۔ جب یہ معاملہ ایک وسیع تر شعوری صورت اختیار کرلے تو غلاموں کو ان کی محنت کی استطاعت کم ہوتے ہی تلف کردینا کوئی بعید از قیاس بات نہیں لگتی۔ آقاؤں کے لیے غلاموں کی حیثیت انسانی نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہوجاتا تو غلامی سرے سے پیدا ہی نہ ہوتی۔

جب وسیع تر پیمانے پر، درجہ بدرجہ، معاشرے میں تجرید کا شعور پروان چڑھا ہوا اور یہ ہزاروں سالوں سے ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہا ہو، تو ایسے میں انسانی ذات اور اس کے شعور کا اپنی اصلیت سے دور ہوجانا ایسا اَن ہونا نہیں لگتا۔ اس شعور میں حکمرانوں سے لے کر ادنیٰ سے ادنیٰ درجے پر بسنے والے سب لوگ برابر کے حصے دار ہوجاتے ہیں۔ سب ایک تجرید میں بستے ہیں اور اسی تجرید کو اپنی زندگی کا حتمی مقصد مان لیتے ہیں۔ حکمران کا شعور ذات انانیت (Egotism) پر مرتکز ہوتا ہے۔ انانیت انسان کے نفسیاتی پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے۔ شخصیت کے دیگر پہلو اتنے ہی اہم ہیں جتنی کہ اَنا۔ اَنا، دراصل انفرادی وجود اور انفرادی شناخت و تحفظ کے لیے ایک جبلّتی قوت کے طور پر انسان میں موجود ہے۔ اگر انانیت کو ذات کے شعور کا بنیادی محرک بنالیا جائے تو اس سے ایک ذہنی بیماری پیدا ہوجاتی ہے۔ فرد اپنی ذات میں تحفظ سے سمٹ کر رہنے کی بجائے، اپنے آپ کی توسیع (Aggrandizement) اور توسیع کا احساس کو پیدا کرنے میں جُت جاتا ہے۔ یہ احساس اس غلام سے مختلف نہیں، جس کی محنت کرنے کی صلاحیت کو اس کی مجموعی شخصیت کا متبادل بنا کر اور ایک تجرید سونپ کر سدھا لیا جاتا ہے۔ انانیت کی بنیاد پر بننے والا شعور ذات بھی اتنا ہی مجرد ہے۔ اس بیماری میں فرد نہ صرف ایک تجرید میں رہتا ہے بلکہ وہ اس تجرید کا قیدی بن کر خود کو توسیع دینے کے لیے سوچتا رہتا ہے کہ ''اگر ایسا ہوجائے تو پھر وہ اس قدر وسیع ہوجائے گا۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔'' دراصل ہوتا یہ ہے کہ وہ ایک ختم نہ ہونے والے چکر میں پھنس کر، اسی کا شکار بن جاتا ہے۔ صرف خود ہی شکار نہیں ہوتا، وہ اپنی طاقت کے بل پر ایسی دنیا بنالیتا ہے جس کا مرکز ظلم ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ کوئی شخص اس وقت تک ظلم کرسکتا ہے جب تک وہ ایک تجرید میں رہے۔ تجرید ہی وہ ایسا ذریعہ ہے، جس میں انسانی

احساس کند ہو جاتا ہے۔ تاریخ میں قتل و غارت گری کی بنیاد اسی احساس پر رہی ہے۔ اس میں کسی شخص، گروہ یا قوم کو دشمن بنا کر اسے ایک تجریدی حیثیت دی جاتی ہے اور پھر اسے مارنا یا ختم کرنا ایک مقدس فرض بنا دیا جاتا ہے۔ سماج کے اندر مختلف پیشوں یا حیثیتوں کی گروہ بندی اور مختلف ہستیوں کی تجرید اسی شعور کے تابع رہی ہے۔ اس طرح ایک عام آدمی، مافوق الانسان بن کر معزز یا پھر ذلیل ہونے کے زمرے میں آ جاتا ہے۔

تجریدیت دراصل بے عملی بڑھانے کا ایک اہم طریقہ ہے۔ اس نے تاریخی طور پر تحکمانہ نظام کے خلاف اٹھنے والی تحریکات کو بے اثر بنا دیا۔ مثال کے طور پر صوفیائے کرامؒ نے بادشاہوں کے جبر اور غیر انسانی رویوں کے خلاف عملی مثال اپنے اسلوبِ زندگی سے دی۔ ان کا فکر اور عملیت (Activism) تحکمانہ نظام کا ایک بہتر متبادل ہو سکتا تھا۔ مگر تحکمانہ نظام کی عمومی تجریدیت کے عمل سے ان بزرگوں کا فکر تقدیر پرستی کی راہ و رسم بڑھانے لگا۔ لوگوں نے ان کے فکر پر عمل کی بجائے ان کی قبروں پر منتیں مانگنے اور چادریں چڑھانے کی رسوم کو ہی مقصد بنا لیا۔ اسی طرح اسلام، سکھ مت، بدھ مت اور عیسائیت کو جو اپنے فکر اور عملیت کے ناطے تحکمانہ نظام کو توڑنے کی اہلیت رکھتے تھے تحکمانہ نظامِ ریاست کا حصہ بنا کر محض رسمی تجرید بنا دیا گیا۔

4

تحکمانہ نظام اور سدھانے کا عمل

تیکایو نے کھانے کی تھیلی اٹھائی اور گایوں کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ گھر سے تھوڑی سی دوری پر گیا تھا کہ اسے آسمان میں ایک عقاب اڑتا نظر آیا۔ عقاب نے اپنے پنجوں میں گوشت کا ایک ٹکڑا اٹھا رکھا تھا۔ عقاب ادھر اُدھر اڑ رہا تھا۔ وہ کسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھا تا کہ وہاں بیٹھ کر اطمینان سے گوشت کھا سکے۔ وہ کم بلندی پر اڑ رہا تھا، تیکایو نے اپنی چھڑی عقاب کی طرف پھینکی۔ عقاب نے گھبراہٹ میں پنجے ڈھیلے کیے اور گوشت کا ٹکڑا نیچے گر گیا۔ یہ کلیجی کا خاصا بڑا ٹکڑا تھا اور اس میں سے تازہ لہو رِس رہا تھا۔ تیکایو نے کلیجی کو پھینک دینے کا سوچا مگر پھر ارادہ بدل لیا۔ اس نے سوچا اگر کلیجی کو پھینکنا ہی تھا تو پھر اسے عقاب کے منہ سے چھیننے کی کیا ضرورت تھی۔

ابھی دوپہر کے کھانے کا وقت نہ ہوا تھا، مگر تیکایو نے آگ جلائی اور کلیجی کو اس پر بھوننا شروع کر دیا۔ بھنتی ہوئی کلیجی سے جو مہک اٹھی، اس نے تیکایو میں بھوک کی شدّت بڑھا دی۔ اس نے ادھ پکی کلیجی ہی کھانا شروع کر دی۔ اسے کلیجی کھانے سے ایسی لذّت ملی، جو اسے زندگی میں کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس نے ساری کلیجی چٹ کر لی بلکہ اپنی انگلیوں پر لگی گاڑھی چکنائی تک چاٹ لی۔ پھر بھی اس کا دل نہ بھرا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اور کلیجی کھا لے۔

گائیں، ادھر اُدھر درختوں کی جھاڑیوں میں بیٹھی جگالی کرنے لگیں۔ تیکایو کو بھی نیند آ گئی اور وہ بھی پیڑ کے نیچے سو گیا۔ اس نے خواب دیکھا کہ وہ آگ پر کلیجی بھون رہا ہے۔ کلیجی میں سے رِسنے

والا خون، قطرہ قطرہ آگ پر گر رہا ہے اور اس سے لذت اور بھوک بڑھانے والی مہک پیدا ہو رہی ہے۔ اس مہک سے اس کی زبان پر لذت کا ایک شدید احساس تتلی کی طرح مچلنے لگا۔ اس سے صبر کرنا مشکل ہو رہا تھا ـــــ اس نے ادھ پکی کلیجی کا ایک ٹکڑا، چاقو سے کاٹ کر اپنے منہ میں رکھا۔ اس سے اس کی زبان جل گئی۔ اسی اثنا میں اس کی آنکھ کھل گئی۔

خواب نے تیکا یو کے اندر مزیدار کلیجی کھانے کی خواہش کو مزید بھڑکا دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ فوراً اتنی مزیدار کلیجی والے جانور کو تلاش کرے اور اس کی کلیجی نکال کر کھا لے۔ اس وقت دن ڈھلنے لگا تھا اور شکار ممکن نہ تھا۔ تیکا یو نے کلیجی کھانے کا معاملہ اگلے دن تک ملتوی کر دیا۔

اگلے دن تیکا یو نے ایک دو جانوروں کا شکار کیا۔ ان کی کلیجی نکالی، بھونی اور کھالی مگر ان کی کلیجی میں وہ لذت نہ تھی جو اس نے ایک روز پہلے کھائی تھی۔ اس نے اپنے علاقے میں ملنے والے قریباً تمام جانوروں کا شکار کیا۔ ان کی کلیجی کھائی مگر عقاب والی کلیجی کا لطف نہ آیا۔ تیکا یو کے دل و دماغ پر اس پُر اسرار کلیجی کو کھانے کا بھوت سوار ہو گیا۔ وہ اس بات پر پریشان تھا کہ آخر وہ کون سا جانور ہے، جس کی کلیجی میں ایک پُر اسرار لذت ہے۔ اسے ہر کھانا، اس لذت کے مقابلے میں بے ذائقہ اور کسیلا محسوس ہونے لگا۔

ایک دن تیکا یو، کلیجی کی پُر اسراریت کو لیے سوچ میں گم، دھوپ میں بیٹھا تھا۔ اس کے پوتے اور پوتیاں گھر کے آنگن میں شور و غل مچاتے، کھیل رہے تھے۔ بچوں کو دیکھ کر اس پر کلیجی کی پُر اسراریت کا بوجھ کم ہو گیا۔

اسی شام، تیکا یو نے اپنی ایک پوتی کو ساتھ لیا اور اسے کھیتوں میں لے گیا۔ اسے ذبح کیا، اس کی کلیجی نکالی اور وہیں آگ پر بھون کر، اسے کھانے لگا۔ اس کا دل اچھل پڑا ـــــ یہی وہ لذت تھی، جسے وہ عرصے سے تلاش کر رہا تھا۔

رات ہونے پر بچی کے گم ہو جانے کا واویلا مچ گیا۔ سارا قبیلہ اور خاص طور پر بچی کے

والدین سخت پریشان ہو گئے۔ انھوں نے بچی کو بستی کے اردگرد، سب جگہوں پر تلاش کیا مگر اس کا کچھ پتا نہ چلا۔ آخر، سب صبر کر کے خاموش ہو گئے۔

تیکا یو نے چند دِنوں کے بعد اپنے ایک پوتے کی جان لی اور اس کی کلیجی نکال کر کھا گیا۔ اس واقعے کے بعد قبیلے والوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ شاید کوئی عقاب، جنگلی جانور یا کوئی بدروح ان کے بچوں کو اٹھا لے جاتی ہے۔ فیصلہ کیا گیا کہ بچوں کی خصوصی نگہداشت کی جائے۔ نگہداشت کا یہ سلسلہ چند ماہ تک جاری رہا اور اس دوران خیریت رہی۔ آہستہ آہستہ نگہبانی کا یہ سلسلہ ڈھیلا پڑنے لگا۔

تیکا یو، اپنی لذّت سے مجبور تھا۔ نگہبانی کے ڈھیلا پڑتے ہی اس نے ایک دن اپنے ایک پوتے کو پکڑا۔ تیکا یو کے بیٹے نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر، خاموشی سے تیکا یو کا پیچھا کرنے لگا۔ تیکا یو پوتے کو کھیتوں میں لے آیا۔ وہ اسے مارنے والا ہی تھا کہ اس کے بیٹے نے تیکا یو کا ہاتھ پکڑ لیا۔

تیکا یو کو ایک جھونپڑی میں قید کر دیا گیا۔ پورا قبیلہ تیکا یو کے معاملے پر دہشت زدہ ہو گیا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ اگلے روز تیکا یو کو سنگسار کر دیا جائے گا۔ صبح سویرے جب قبیلے کے لوگ تیکا یو کو لینے اس کی جھونپڑی میں آئے تو انھوں نے دیکھا تیکا یو پھندے پر لٹکا ہوا تھا۔

قبیلے والوں نے تیکا یو کو قبیلے کے قبرستان سے الگ ایک جگہ پر دفنا دیا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ قبیلے میں کسی بچے کا نام تیکا یو نہیں رکھا جائے گا۔

(ایک افریقی مصنف کی کہانی۔ مجلّہ 'آج' کراچی)

یہ ایک علامتی کہانی ہے۔ تیکا یو ایسی لذّت کا اسیر ہو گیا جو اسے انسانی سطح سے نیچے گرا دیتی ہے لہٰذا وہ انسانیت کے رشتے سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایسے میں وہ اپنے پیاروں کو بھی کھا جانے سے گریز نہیں کرتا۔

انانیت پر مرتکز خواہش کی تسکین اور اسے پا لینے کی لذت، ہیکا یو کی طرح نہ صرف انسانوں کو کھا جانے پر اکساتی ہے بلکہ اس عمل میں خود اس لذت کا شکار بننے والا بھی انسان نہیں رہتا۔ وہ انسانوں میں رہتے ہوئے، انسانی شکل میں ایک درندہ ہوتا ہے۔ ایسی انسان دشمن لذتوں سے تشدد جنم لیتا ہے۔ اگر حاکمیت کی سطح پر انانیت کی لذت ایک حکمتِ عملی کی صورت دھار لے تو پھر اس معاشرے میں بسے لوگ نہایت خاموشی سے تشدد کا شکار بنتے رہتے ہیں بلکہ ان کا عمومی سماجی وطیرہ بھی تشدد کی بنیاد پر ہی پنپتا ہے۔

II

کوئی بھی شخص اپنے داخلی احساسات کے اظہار کے لیے دوسرے لوگوں کا محتاج ہوتا ہے۔ آپ میں اگر پیار کا احساس ہے تو پیار کے اظہار کے لیے آپ کو کسی ذات کی ضرورت ہوگی۔ اگر دل میں نفرت ہے تو، دوسرے انسانوں اور دیگر جانداروں سے آپ کے رویے میں نفرت کے جذبات غالب رہیں گے۔ اگر آپ اپنی ذاتی ہوس میں مکمل طور پر گم ہو گئے ہیں تو لامحالہ اس کا اثر آپ کے اردگرد لوگوں پر پڑے گا۔

کوئی بھی فرد اپنے احساسات اور خیالات کو دوسرے تک پہنچانے کے لیے اشاروں کنایوں، بات چیت اور بات میں زور پیدا کرنے کے لیے آواز کو اوپر نیچے کرے گا۔ بات میں احساس کی شدت پیدا کرنے کے لیے جذباتی زیروبم پیدا کرے گا۔ اگر اس سے بھی قبولیت نہ ملے تو سر جھکا کر، ہاتھ جوڑ کر، سجدہ کر کے، پاؤں کو ہاتھ لگا کر، تحفہ دے کر، ستائش کر کے، خوشامد کر کے، بہلا پھسلا کر اور نجانے کیا کچھ کر کے دوسرے فرد کی قبولیت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

دراصل کوئی بھی فرد ایک جسم میں بستا ہے۔ فرد صرف جسم نہیں ہوتا وہ احساسات، تصورات، خودمختار مرضی اور ایسے ہی معاملات کی کلیت (Totality) ہوتا ہے۔ اس کلیت پر اس فرد کا

اختیار ہوتا ہے۔ یہ فرد، چونکہ ایک جسم کی شناخت سے بندھا ہوتا ہے، اس لیے جسم ہی ذریعہ ہے، جس کی بدولت اس فرد کی کلیت اور کلیت کے شعور تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اسی لیے جسم کو اس انفرادی شعور اور کلیت کا حفاظتی حصار (Body Armour) کہا جاتا ہے۔

انسانی جسم، اپنے اردگرد لوگوں سے رشتے ناتے کے تناظر میں، اپنے ہر عضو کی مخصوص سماجی شناخت (Social Identity) بناتا ہے۔ مثال کے طور پر ہاتھ کو ہی لیں۔ اگر فرد کسی سے قبولیت محسوس کرتا ہے تو ہاتھ بڑی گرمجوشی سے ملائے گا۔ بصورت دیگر ہاتھوں کی پکڑ اور انداز ڈھیلا ڈھالا ہی رہے گا۔ اگر دل میں قبولیت کی گرمجوشی زیادہ ہے تو دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا جائے گا بلکہ ساتھ ہی بازو کو بھی چھوا جائے گا۔ اگر گرمجوشی کا درجہ اس سے بھی زیادہ ہے تو پھر گلے ملا جائے گا۔ گلے ملنے کے بھی جذبات کے حساب سے درجات ہیں۔ ایک درجہ آئے گا کہ آپ گلے ملتے وقت، دوسرے کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کریں گے۔ ایسا ہی معاملہ آنکھوں کا ہے۔ آنکھیں دل و دماغ میں موجود تاثرات کی ہوبہو عکاس ہوتی ہیں۔ آنکھوں میں پیار کی نمی لیے، کوئی آپ کو دیکھ لے تو مصافحے، گلے ملنے کے تکلف اور وسیلے کی ضرورت نہیں رہتی۔ صرف ایک جھلک سے ہی قبولیت کا سفر طے ہو جاتا ہے۔

یہ تو ہوئی قبولیت کی بات۔۔۔ اور اگر دل میں بے ساختہ قبولیت نہ ہو تو جسمانی اعضا کے تاثرات یکسر بدل جائیں گے۔ آپ جس کو پسند نہیں کرتے، اس سے ہاتھ ملانا تو کیا آپ اس کی طرف نظر بھی اٹھا کر نہ دیکھیں گے۔ اگر مجبوری میں ہاتھ ملانا پڑ جائے تو یہ مصافحے کی سرسری رسمیت سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔ اگر ایسا ناپسندیدہ شخص آپ کے ساتھ آ بیٹھے تو اس کے ساتھ مَس ہونے والا پہلو جیسے ہزار من بھاری ہو جائے گا۔ آپ اس کے ساتھ گفتگو کرنے سے پرہیز کریں گے۔ اگر مجبوری ہوئی تو کم سے کم الفاظ میں گزارہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ اوّل تو ہوں/ہاں یا سر اور ہاتھوں کی جنبش سے ہی گزارہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجبوری کی ایک صورت حال میں جو نا گزیر ہے اور آپ کو گزارہ کرنا ہی

ہے۔ مثال کے طور پر ایک غلام کی مثال لیتے ہیں، جس کو افریقہ سے جہاز میں لاد کر امریکہ پہنچا دیا گیا تھا۔ اسے ایک سفید فام امریکی نے خرید لیا۔ سفید فام اس سے اپنے گنے کے کھیتوں میں کام کروانا چاہتا تھا۔ اس سے مویشیوں اور گھر کی دیکھ بھال کروانا چاہتا تھا۔ ان تمام امور کی انجام دہی کے عوض اسے روٹی کپڑا اور رہنے کے لیے جھونپڑی ملنا تھی۔ سیاہ فام نے سوچا کہ اسے اس کی مرضی کے خلاف زبردستی اٹھا کر امریکہ لایا گیا۔ لہٰذا وہ امریکی کے ہاں کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ وہاں سے بھاگ گیا۔ فارم شہر سے دور ایک کھلی جگہ پر تھا۔ راستے میں کسی نے سیاہ فام کو دیکھا اور پکڑ کر پھر اسی فارم کے مالک کے پاس لے آیا۔ فارم کے مالک نے غلام کو گالیاں دیں، اسے تھپڑ مارے اور پھر چمڑے کی چابک سے خوب مارا۔ آخر اس کے دونوں پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر اسے جھونپڑی میں پھینک دیا۔ غلام کو شدید طیش آیا، اس نے بڑی ذلت محسوس کی مگر ساتھ ہی اس نے اپنے آپ کو بے بس اور مجبور بھی محسوس کیا۔

وہ شام تک دل جلاتا رہا، اپنی حالت پر رویا بھی—— مگر وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ افریقہ میں وہ بھیڑ بکریاں پالتا تھا۔ اس کی زندگی بہت اچھی تھی—— اپنی زندگی پر اس کا اختیار تھا۔ یہاں بھی اسے اختیار ہے کہ وہ کسی کا کام کرے یا نہ کرے۔ رات گئے، چند اور غلام اس کی جھونپڑی میں آئے۔ انھوں نے اسے سمجھایا کہ اب وہ اختیار اور مرضی والا شخص نہیں، ایک غلام ہو گیا ہے۔ غلام وہ ہوتا ہے، جس کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی، وہ اپنے مالک کی مرضی کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔ تم افریقہ میں بھی محنت کر کے، آخر روٹی ہی تو کھاتے تھے۔ یہ سب تم کو یہاں بھی ملے گا۔ غلام کو اپنی مجبوری اور بے بسی کا احساس تو تھا ہی، ساتھی غلاموں کی نصیحتیں، اسے کسی قدر تسکین بخش لگیں۔ مگر اب بھی وہ اپنے سفید فام امریکی آقا کو اوّل تو دیکھتا ہی نہ تھا، اگر دیکھتا تو اس میں نفرت کا شعلہ صاف طور پر دکھائی دیتا تھا۔ وہ دوسرے غلاموں کے ساتھ کھیتوں تک تو چلا جاتا مگر وہاں ایک طرف بیٹھا رہتا۔

ایک دن غلاموں سے کام لینے والے، بڑے غلام نے اس افریقی کو پیٹا تاکہ وہ کام شروع

کردے۔ اس وقت اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ وہ چپ چاپ مار کھاتا رہا۔۔۔ وہ جواب میں کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ جب یہ سب مار پیٹ ختم ہو گئی تو ساتھی غلاموں نے پھر اسے سمجھایا کہ وہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو تکلیف دے رہا ہے۔ اسے تھوڑا بہت کام شروع کر دینا چاہیے۔ چند روز میں غلام نے گنے کے کھیتوں میں کٹائی کا کام تو نہ کیا البتہ کٹے ہوئے گنوں کو بندھوانا شروع کر دیا۔

انھی دنوں اس علاقے کا ایک بڑا پادری اس فارم پر آیا۔ سب لوگوں نے اسے بڑے احترام سے اپنے ہاتھوں پر لیا۔ پادری نے اس غلام کو تنہائی میں بات کرنے کا موقع دیا۔ غلام نے اس پر ہونے والے ظلم اور مار پیٹ کی شکایت کی اور اس سے کہا کہ اس کے ساتھ جو ہوا وہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ تاہم اس نے غلام کو سمجھایا کہ اس کے بزرگوں کی روحیں اس کے پاس خواب میں آئی تھیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ کھیتوں پر کام کرنا، بھیڑ بکریاں پالنے سے بہتر ہے۔ جو کھیتوں پر زیادہ محنت کرے گا اسے بزرگوں کا پیار بھی زیادہ ملے گا۔ وہی ان کا سب سے پسندیدہ ہو جائے گا۔ افریقہ سے آیا غلام، اس دن کے بعد دوسرے غلاموں کی طرح مکمل طور پر غلام ہو گیا۔ وہ جس قدر زیادہ کام کھیتوں میں کرتا، اتنا ہی خوش ہوتا۔ اس کے مالک کی آمدنی دن بدن بڑھتی گئی۔

قبولیت کی یہ بھی ایک صورت ہے جس کو پیدا کرنے کے لیے دوسرے کے اختیار اور مرضی کو اپنے تابع کر کے، اس کے انفرادی شعور کو اپنے قبضے میں کر لیا جائے۔ قبولیت کے اس طریقے کے لیے تشدد کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ تشدد کا مطلب دراصل اس جسمانی حصار کو توڑنا ہے، جو ایک شعور ذات کے گرد بنی ہوتی ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں:

i- جسمانی ایذا اور سزائیں دے کر کسی کام کے لیے مجبور کرنا۔ اس کی بنیاد جانوروں کے سدھانے پر ہے۔ مثال کے طور پر بندر کو ناچنا سکھانے کے لیے، چھڑی کے مخصوص اشاروں کے تحت مخصوص حرکات کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ان حرکات کو مستقل صورت میں ڈھالنے (Conditioning) کے لیے اسے ایذا دی جاتی ہے۔

جسمانی اذیت کے خوف سے بچنے کے لیے بندر آہستہ آہستہ یہ مخصوص حرکات کرنا سیکھ جاتا ہے۔ اسی طرح انسانوں میں مخصوص حرکات اور اعمال پیدا کرنے کے لیے انھیں ایذا دینے کا معاملہ شروع ہوا اور اس سے وسیع تر غلامی پیدا ہوئی۔ پہلے جنگ میں مقبوضہ علاقے کے لوگوں کو قتل کر دیا جاتا تھا پھر انھیں نئی زمینوں کو آباد کرنے کے لیے غلام بنا لینے کا رواج شروع ہوا۔ یہ دراصل ان غلاموں کی جسمانی قوت کو پیداوار کے لیے استعمال کرنے کا معاملہ تھا۔ اس مخصوص کام کے لیے، انھیں جسمانی ایذا دے کر مجبور کیا جاتا تھا اور اس طرح وہ آہستہ آہستہ سدھا لیے جاتے تھے۔

ii- تشدد کا ایک پہلو ایسے حربے استعمال کرنا ہے، جن سے کوئی بھی انسان اپنی مرضی (Will) کو کسی دوسرے کی مرضی کے تابع کر دے۔ یہ بھی سدھانے کی ہی صورت ہے مگر اس کا استعمال بالخصوص انسانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر عورتوں سے جنسی ربط منوانے کا ایک طریقہ ان پر جسمانی تشدد ہے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ عورت کو سمجھا دیا جائے کہ والدین کے پسند کردہ کسی بھی مرد سے وہ شادی کر لے تو اسے بہت اچھی لڑکی قرار دے دیا جائے گا۔ لوگ اس کی تعریف کریں گے۔ اس صورت میں وہ ایسے شخص کو قبولیت دے گی جو ہوسکتا ہے اس کی مرضی اور پسند کا نہ ہو۔ پُر تشدد جنسی راہ رسم میں بھی وہ اپنی سپردگی، مرضی سے نہیں کرتی مگر اس دوسری صورت میں اس کی مرضی تو نہیں ہوتی مگر اسے مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ جنسی تعلق کی اجازت دے دے۔ یعنی یہ کہ کسی بھی فرد کی جسمانی یا دماغی صلاحیتوں کو اگر متاثر کر کے یا سدھا کر استعمال کیا جائے تو یہ بھی تشدد ہی ہوگا۔

انسانی قبولیت، مرضی اور اختیار کے بغیر ممکن نہیں۔ جب انسانوں کو غیر انسانی سطح پر استعمال کرنا ہو تو 'قبولیت' کے لیے تشدد کے طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس سے کسی بھی فرد کی مرضی اور اختیار کو شکست دی جاسکتی ہے۔ تشدد کرنے والا مرضی اور اختیار کا حصار توڑ کر اپنے آپ

کا احساس دلاتا ہے۔ تشدد کا شکار ہونے والا فرد اس احساس تلے ایک مجبور کی طرح رہنے لگتا ہے۔ وہ اپنے ہر طرف، تشدد کرنے والے کی موجودگی محسوس کرتا ہے۔

تاریخ میں تشدد کی ابتدا، جابروں نے شروع کی (Freire, P:1972. 32)۔ مگر اس سے جو ماحول بنا، اس میں مجبور بھی اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے تشدد کا طریقہ ہی استعمال کرتے ہیں۔ متشدد رویوں کے تحت بننے والی زندگی میں تشدد ایک اہم سماجی طریقہ (Social Method) بن جاتا ہے۔ ایسے میں سب کے باہمی رشتوں میں تشدد کا اثر رہتا ہے۔ مثال کے طور پر بچے کی 'تربیت' میں جسمانی اور ذہنی تشدد بنیادی طریقے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ بیویوں کو 'حد میں رکھنے' کے لیے ان کو پیٹنا، مرد کا حق سمجھا جاتا ہے۔ عورت جب مجبور ہوتی ہے تو وہ اپنے گال پیٹتی ہے۔ بچوں کو بلا جواز مارتی ہے اور جب زندگی میں محدود گزرگاہیں بھی بند ہو جائیں تو اپنے آپ کو مار لینا۔ اپنے آپ کو مارنا، دراصل اپنے پن (Selfhood) اور وجود (Being) کے احساس کو منوانے کی ہی کوشش ہوتا ہے—— آخری کوشش۔

گزشتہ پانچ چھے ہزار سال سے افراد کو سدھا کر ریاستی نظام کے لیے کارآمد شہری بنانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسے ایک نظام کی شکل ملی کیونکہ ایک طویل عرصے سے کسی ایسے نظام کی ضرورت کو محسوس کیا جا رہا تھا جو فرد اور اس کے باہمی رشتوں اور سماجی اداروں کے لیے بنیاد بن سکے۔ نہ صرف یہ، اس نظام کو ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانے کے لیے تربیت کے اسلوب (Learning Strategies) طے ہوئے اور اس کے بہت اندر کوکھ میں ایک خود حفاظتی ڈھانچہ (Mechanism for Self-defence) تعمیر ہوا۔

چونکہ اس نظام میں بنیادی محرک تحکم (Authority) ہے، اس لیے اسے تحکمانہ نظام (Authoritarianism) کہنا مناسب ہوگا۔ تحکمانہ نظام میں کسی بھی رویے یا تعلق کی بنیاد پر ایک عنصر یا رکن کو زبردست (Oppressor) اور دوسرے کو زیر

دست (Oppressed) بنادیا جاتا ہے۔ اپنی کارکردگی یا معانی کے اعتبار سے تحکمانہ نظام رشتوں، رویّوں یا اجتماعی مزاج کو پیدا کرتا ہے۔ اس تعلق یا بندوبست میں شریک عناصر: دو افراد، ایک ادارہ اور فرد، ایک ادارہ یا بہت سے افراد، دو ادارے، فرد اور معاشرہ، فرد/افراد اور خاندان اور علیٰ ہذا القیاس عناصر یا ارکان شامل ہو سکتے ہیں۔ تحکمانہ رشتے اپنی اساس میں ایک نفسیاتی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اس میں زبردست اپنی غرض یا جبلی لذتوں کے زیر اثر دوسروں کو محکوم یا زیردست بناتا ہے۔ زیردست اس نفسیاتی کیفیت میں اپنے آپ کو زبردست کے ہاتھوں میں سونپ دیتا ہے یعنی اپنی انسان ہونے کی بنیادی خوبی...... خودمختاری سے الگ ہو جاتا ہے۔ عام طور پر تحکمانہ رشتے کے بارے میں ایک ابہام یہ پایا جاتا ہے کہ محکوم کو اس کی لاعلمی یا کمزور عقلی کے باعث ایک مخصوص چوکھٹے میں مقیّد کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جیسا کہ بچے کی تربیت کے سلسلے میں تحکم کو لازمی طریقے کے طور پر استعمال کرنا کسی قدر جائز سمجھا جاتا ہے۔ مخصوص چوکھٹے میں رکھنے کا مقصد محکوم کو تحفظ فراہم کرنا ہوتا ہے جو وہ اپنی ناقص عقل کے باعث خود کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اس کے لیے جواز یہ ہوتا ہے کہ بچہ اپنا بھلا بُرا نہیں سمجھتا۔ اگر اسے تحکم کے رشتے میں باندھ دیا جائے تو وہ کسی قسم کے پس و پیش کے بغیر سیکھتا چلا جائے گا۔ سچائی یہ ہے کہ ایسی دلیل اور ایسا طریقہ اپنی ذات میں ہی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ہمارے ہاں صدیوں پرانا تحکمانہ نظام بدستور جاری ہے۔ اس نظام میں بادشاہ اور اس کے تحکمانہ جبر کا جواز بھی یہی دیا جاتا تھا کہ عوام دراصل بھیڑیں ہیں اور بادشاہ ان کا چرواہا ہے، جو ان کی حفاظت کرتا ہے۔ عورت ناقص العقل ہے اور اس کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ وہ خاوند کے تحکم کے ساتھ بندھی رہے۔ بچہ دراصل ایک خالی سلیٹ جیسا دماغ لے کر دنیا میں آتا ہے اور اس پر اس کے بڑے جو چاہیں نقش بنا سکتے ہیں۔ یہ سب دلیلیں دراصل تحکمانہ نظام کو تسلسل دینے کا ذریعہ ہیں اور ان کا لوگوں کے ذہن میں ہونا اور عملی صورت میں ان کی تنفیذ اس بات کی نشاندہی ہے کہ دراصل اب بھی تحکمانہ نظام اپنی قوّت کے ساتھ جاری ہے۔

خودمختاری کی بنیاد یہ ہے کہ آپ بچے، عورتوں اور عوام الناس کو سوال اٹھانے دیں۔ ان کے سوال خواہ کس قدر سادہ اور 'بےعقلی' پر مبنی ہوں، دراصل تو وہ ان کے حقیقی حالات اور ذہنی صورت حال کی نمائندگی کریں گے۔ ایک مزدور یا ایک کسان اپنے کام کے اعتبار سے نہایت مفید سماجی رکن ہے۔ اگر آپ ان کو فیصلہ سازی کے عمل کا حصہ بنانا چاہتے ہیں تو ان کے سوالات و خیالات کو اہمیت دینا ہوگی۔ یہیں سے ان کی خودمختاری کا عمل شروع ہوگا۔ یہی صورت بچے سے متعلق ہے۔ بچے میں فطری طور پر عقل سلیم (Common Sense) ہوتی ہے۔ اسی کی بنیاد پر وہ مختلف صورت حال اور کیفیات پر سوال کرتا ہے اور تجربے سے گزرنا چاہتا ہے۔ یہی طریقہ ہے، جس سے گزر کر وہ خودمختار شعور حاصل کر سکتا ہے۔

تحکمانہ نظام کا بنیادی مقصد محکوم کو حاکم کا محتاج بنانا ہوتا ہے، اس لیے سوال اور خود اختیاری کو ناپسندیدہ فعل سمجھا جاتا ہے۔ تحکم ہی وہ بنیادی محرک ہے، جس میں کسی فرد کو اس کی فطری صلاحیتوں اور خودمختاری سے الگ ہونے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنے کے بعد اسے سدھانا ممکن ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کوئی فرد آخر کن حالت میں انسان ہونے کے ناطے اپنے بنیادی حقوق اور بنیادی خصوصیات سے دستبردار ہو جاتا ہے؟

i- کوئی بھی فرد اپنے وجود/پیدائش کے حوالے سے ایک تاریخی صورت حال (Historical Situation) میں اپنی زندگی شروع کرتا ہے۔ وہ جس ماحول (خاندان، معاشی وسائل اور شعوری حدود) میں پیدا ہوتا ہے، اس کے بننے کے پیچھے ایک تاریخی سلسلہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اس فرد کا وجود، اپنے مخصوص حالات کی مناسبت سے تاریخی ہوتا ہے (Marx)۔ اگر فرد کے اردگرد تاریخی ماحول میں تحکمانہ روایت غالب رہی ہو تو وہ فرد لامحالہ کسی دقّت کے بغیر، اس نظام میں ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے۔

ii- تحکمانہ نظام اپنی طویل تاریخ کے باعث، نہایت پیچیدہ اسالیب اور

طریقے رکھتا ہے۔ کوئی بھی فرد اس میں اتنا جکڑ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی مجبوری کے احساس کے باوجود بھی اس سے بھاگ نہیں سکتا۔ اس کے پاس متبادل شعور استوار کرنے کے لیے متعلقہ علم نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہو بھی تو متبادل مادی وسائل نہیں مہیا کر پاتا ـــــ اس طرح بیچارگی اور بے بسی میں زندگی گھسیٹا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر زارا کے معاملے کو ہی لیں۔ اگر وہ بڑی ہو کر اپنی زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے بھی تو اسے اپنے سگوں سے کمک نہ ملے گی ـــــ اس طرح وہ بے بس اور بے اختیار زندگی گزارتی رہے گی۔ وہ تحکمانہ نظام سے بھاگنے کی کوشش تو کرے گی مگر اس نظام کا خود حفاظتی ڈھانچہ اسے پھر واپس دھکیل دے گا۔

iii- تحکم کی جڑیں مادی طاقت میں ہیں۔ **مادی طاقت کا انحصار** وسائل زندگی اور پیداوار پر دسترس پر ہے۔ یہ دسترس **جنگی صلاحیت کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر آپ جنگی** صلاحیت سے دوسروں کے وسائل اور خود ان کے جسمانی وجود تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں، تو ناگزیر طور پر آپ میں اہلیت ہے کہ آپ دوسروں کو ان کی زندگی سے متعلق خوف میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ یہی خوف اور عدم سلامتی کا احساس، تحکم کی غذا ہے، جسے کھا کر وہ خوب پلتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک عورت جس کا تعلق درمیانے طبقے سے ہے، وہ تحکمانہ نظام میں عورت کی حیثیت کو سمجھتی ہے۔ وہ اس سے باہر نکلنا چاہتی ہے، اس کے پاس مادی وسائل ہیں ـــــ مگر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اسے کسی بستی میں کوئی شخص کرائے پر مکان دینے کو تیار نہ ہوگا۔ لوگ اس کے اکیلے رہنے کو شک کی نظر سے دیکھیں گے۔ وہ سڑک سے گزرے گی تو اسے قابلِ خرید شے کے طور پر بے باک نظروں سے الجھنا ہوگا۔ یہ سب باتیں، صرف سوچنے سے ہی اس خاتون میں اپنی ذات کو لے کر خوف اور عدم سلامتی بھر دیں گی۔ تحکمانہ نظام میں

خوف اور عدم سلامتی کی فضا دراصل رشتوں کے وسیع معانی اور پھیلاؤ میں ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ جب رشتوں کو قبول کر لیا جائے تو خوف اور عدم سلامتی کے تصورات اور عملی برتاؤ کو بھی قبولیت دینا ناگزیر ہوتا ہے۔ یہی تصورات اور ان کی قبولیت تحکمانہ نظام کی توسیع اور خود حفاظتی ڈھانچے کی روح ہے۔ جب کوئی مجبور، ایک تحکمانہ نظام میں آ جاتا ہے تو اس کا شعور ناگزیر طور پر اس نظام کے لیے خام مال مہیا کرنا شروع کر دیتا ہے۔

iv- تحکمانہ نظام کے تحت بننے والا تعلق ہمیشہ یک طرفہ ہوتا ہے۔ اس میں صرف دو ہی رشتے ہوتے ہیں۔ ایک جبر کرنے والا اور ایک جبر سہنے والا۔ یہ رشتے حکومتی نظام میں اوپر سے نیچے تک ہر ادارے میں موجود ہوتے ہیں۔ چونکہ افراد کو ہی اس نظام میں کارآمد پرزوں کے طور پر کام کرنا ہوتا ہے، اس لیے سماجی رشتوں میں بھی تحکمانہ انداز معاشرت کا آ جانا ناگزیر ہوتا ہے۔ سماجی رشتوں کی بنیاد اور مجموعی سماجی ڈھانچے کی بنیاد کنبے پر ہوتی ہے۔ اس لیے کنبے میں بھی تحکمانہ رشتے سازی کا ہونا لازم ہے۔ تربیت میں کنبے اور سکول کا کردار بنیادی ہے۔ اس لیے یہاں بھی تحکمانہ انداز تربیت کو ہی موزوں سمجھا گیا۔ چونکہ ایک فرد کے ارد گرد موجود اداروں کا مقصد، فرد کو تحکمانہ اندازِ معاشرت میں ڈھال کر حکومتی ڈھانچے کے لیے ایک مفید کارکن بنانا ہے، اس لیے ان اداروں کا کردار بھی لامحالہ تحکمانہ ہی رہتا ہے۔ گھر میں خاوند/باپ، تحکم کی جگہ پر اور بیوی اور بچے محکوم کی جگہ پر، سکول میں استاد تحکم کی جگہ پر اور بچے محکوم کی جگہ پر، دفتر میں افسر تحکم کی جگہ پر اور ماتحت محکوم کی جگہ پر ـــــ اس طرح پوری آبادی اپنی زندگی گزارنے میں محکوم اور حاکمیت کے اسالیب میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ہر درجے پر حاکم اور محکوم کے رشتوں کا ہونا، دراصل اجتماعی تحکمانہ نظام کو نہ صرف توسیع دیتا ہے بلکہ اس کی حفاظت کا بھی بندوبست کرتا ہے۔

-v حاکم اور محکوم کی تقسیم میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ایک شخص حاکم بھی ہوتا ہے اور محکوم بھی۔ باپ/ خاوند گھر میں حاکم کی جگہ پر ہے تو ممکن ہے کہ دفتر میں محکوم کی جگہ پر رہتا ہو۔ ایک افسر، اپنی حیثیت میں حاکم ہو سکتا ہے مگر تحکم کی درجہ بندی میں، وہ کسی کے ماتحت ہونے کے باعث محکوم بھی ہے۔ اس طرح تحکمانہ نظام معاشرت میں ایک فرد اپنی ذات اور اس کے شعور کے اعتبار سے دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ اس کی شخصیت دو متضاد رویّوں (Divided Self) کی زد میں آکر بٹ جاتی ہے۔ متضاد ان معنوں میں کیونکہ حاکمیت قائم رکھنے اور حاکمیت کے سامنے مجبور بن کر رہنے میں بالکل مختلف نفسیاتی حربوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ دونوں حربے مختلف قسم کا شعورِ ذات پیدا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر خاوند گھر میں تو بڑا سخت گیر ہوتا ہے مگر دفتر میں افسر کے سامنے بالکل چوہا۔ ایک افسر اپنے حلقۂ اثر میں بڑا بدمزاج حاکم ہوتا ہے تو اپنے افسر کے سامنے بالکل فرمانبردار۔

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ تحکمانہ نظام میں صرف دو رویے ہی زندگی کا بنیادی اسلوب طے کرتے ہیں ـــــ ایک حاکمیت کو برقرار رکھنا اور دوسرا محکومیت میں زندہ رہنے کا سلیقہ۔ محکومیت میں گزارہ کرنا مجبوری تو ہے مگر مجبوروں کا حتمی نصب العین حاکمیت کی جگہ پر آنا ہی ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ تحکمانہ نظام نے جو سانچے طے کیے ہیں، وہ ایک دائرہ بناتے ہیں اور اس دائرے میں کوئی بھی خواہش، اسلوبِ زندگی (Way of Life) یا نصب العین (Target) اسی کا رنگ لیے ہوتے ہیں ہے۔

III

تحکمانہ نظام میں بنیادی اسلوب زندگی مجبوری اور مجبور و بے بس رہ کر زندگی گزارنا ہے۔ اس کی مختلف زاویوں سے تربیت کی جاتی ہے۔ مجموعی طور پر اس تربیتی نظام میں مندرجہ ذیل

طریقے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی مدد سے کسی بھی فرد کی فطری صلاحیتوں کو سدھا کر مجبور رہنے کی تجریدی کیفیت میں ڈھال دیا جاتا ہے۔

''شیر کو چڑیا گھر میں لایا گیا۔ وہ اگرچہ بہت بھوکا تھا مگر اپنی قید کی وجہ سے سخت مضطرب اور بے چین، پنجرے میں مجبوری محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ایسی مجبوری اپنی ساری زندگی میں کبھی محسوس نہ کی تھی۔ اس نے چڑیا گھر میں آنے والا پہلا دن بہت اذیت میں گزارا۔ اگلے دن وہ صبح سے ہی بھوک سے پریشان تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس کے پنجرے میں گھاس پھینک دی گئی۔ شیر نے سوچا کہ شاید چڑیا گھر والے اس کے بیٹھنے کے لیے گھاس پھینک رہے ہیں۔ وہ ایک طرف چپکا بیٹھا رہا۔ چڑیا گھر کے ملازم پنجرے کے سامنے کچھ دیر کھڑے رہے اور پھر رخصت ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد ایک ملازم شیر کے پنجرے کے پاس آیا اور حوض میں پانی ڈالنا شروع کر دیا۔ شیر نے اس سے پوچھا:

''بھوک لگی ہے۔۔۔ بھائی، ادھر کھانے کے لیے کچھ ملے گا کیا۔۔۔؟''

''وہ گھاس تو رکھی ہے، تمھارے لیے ہی تو ہے۔۔۔''

''میں تو گھاس نہیں کھاتا ـــــ میں گوشت خور ہوں اور گوشت ہی کھاتا ہوں ـــــ تازہ گوشت، خود شکار کر کے۔۔۔ چلو اگر ادھر یہ ممکن نہیں ـــ کم سے کم گوشت تو ہونا چاہیے۔۔۔!''

''میاں، بڑے صاحب نے تمھارے سامنے گھاس ڈالنے کا حکم دیا تھا، سو، ہم نے ڈال دی۔۔۔ کھانا ہے تو کھاؤ، ورنہ تمھاری مرضی۔۔۔!''

شیر کو اس بات پر بڑا غصہ آیا۔ وہ غرّایا اور طیش میں پنجرے کے چکر لگانے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا:

'' کیسے عجیب لوگ ہیں اور ظالم بھی ـــــ بھلا ایسے بھی کبھی ہوا ہے کہ کوئی گوشت خور جانور گھاس کھانے بیٹھ جائے ۔۔۔؟''

اسی طرح دو دن گزر گئے ۔ تیسرے روز چڑیا گھر کے ملازم شیر کے پنجرے کے پاس آئے اور انھوں نے پھر شیر کے سامنے گھاس ڈال دی۔ شیر کہنے لگا:

''یہ کیا بدتمیزی ہے میں گوشت خور ہوں ــــ میں کیسے گھاس کھا سکتا ہوں ۔۔۔؟''

''یہاں تمھیں کھانے کے لیے صرف گھاس ہی ملے گی ، اگر بھوک مٹانا ہے تو گھاس کو ہی کھانا ہوگا۔ ورنہ مرتے ہو تو مرو۔۔۔''

تیسرا دن بھی گزر گیا۔ شیر جسمانی طور پر کمزور ہونے لگا۔ جسم میں کمزوری آئی تو اس کا غصہ بھی ٹھنڈا ہونے لگا۔ اس نے سوچنا شروع کر دیا:

''میں جن جانوروں کا گوشت کھاتا ہوں، وہ گھاس پر پلتے ہیں۔ اس گھاس سے ان کا گوشت بنتا ہے، جسے میں کھا لیتا ہوں۔ اگر میں گھاس ہی کھا لوں تو اس میں مضائقے والی بات تو کوئی نہیں۔'

چوتھے روز شیر نے چڑیا گھر کے ملازموں سے کہا کہ وہ گھاس کھانے پر تیار ہے بشرطیکہ اسے تازہ گھاس دی جائے۔

چڑیا گھر کے ملازموں نے کہا:

''ٹھیک ہے کہ تم گھاس کھانے پر تیار ہو گئے ہو، یہ اچھی بات ہے۔ تم چڑیا گھر کی انتظامیہ کے ساتھ تعاون کر رہے ہو ــــ مگر اب گھاس تمھیں صرف اسی صورت میں ملے گی ، جب تم بلی کی طرح 'میاؤں میاؤں' کرو گے۔۔۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔۔۔؟ ٹھیک ہے بلی سے میرا دور کا رشتہ ہے مگر میں تو شیر ہوں اور میں تو

دھاڑتا ہوں ــــ بھلا میں بلی کی آواز کیسے نکال سکتا ہوں۔۔۔''

''گھاس تو صرف اسی صورت میں ملے گی جب تم بلی کی طرح 'میاؤں' کی آواز نکالو گے ۔۔۔ ویسے تمھاری مرضی۔۔۔''

شیر بڑی الجھن میں پھنس گیا۔ مزید دو دن گزرے تو کمزوری کے باعث چل بھی نہ سکتا تھا۔ اس نے سوچنا شروع کر دیا: 'اس طرح اگر وہ ضد پر اَڑا رہا تو وہ مر جائے گا۔ صرف بلی کی طرح میاؤں ہی تو کرنا ہے۔ اگر یہ آواز نکال لوں تو کم از کم گھاس تو مل ہی جائے گی۔۔۔'

شیر نے میاؤں کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ کمزور تو پہلے ہی تھا، اس کے حلق سے دھاڑنے کی آواز تو نکلنا محال تھی۔ اس نے اگلے دن ملازموں کے سامنے 'میاؤں' کی آواز نکالی۔ ملازموں نے کہا:

''میاؤں کی آواز ہو بہو بلی جیسی ہونی چاہیے ــــ اسے مزید بہتر کرنا ہوگا۔۔۔''

شیر نے آخر کوشش کر کے بلی سی میاؤں کر ہی ڈالی۔ اسے تازہ گھاس مل گئی۔ اس نے گھاس کو منہ میں لیا اور چبانے لگا۔ اسے گھاس کا تازہ رس بڑا رسیلا محسوس ہوا۔''

(شام کے ایک مصنف کی کہانی کا خلاصہ جو 'آج' کراچی میں چھپی ہے۔)

سدھانا، محض میکانکی عمل نہیں ہوتا، اس میں بنیادی بات آپ کے 'ہونے' کے شعور کو بدلنا ہوتا ہے۔ شیر اس وقت تک گھاس نہیں کھا سکتا جب تک وہ اپنے شیر ہونے کے شعور کو ترک نہیں کرتا۔ فطری شعور کو بدلنے کے لیے ایسی صورت حال پیدا کرنا لازم ہے، جس سے فرار کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ فرار کی گنجائش نہ ہو تو آہستہ آہستہ کوئی بھی فرد بے بسی (Helplessness) میں رہنا سیکھ لیتا ہے۔

ایک بچے کی مثال لیں۔ تحکمانہ نظام میں اس کی تربیت کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ مجبور

رہنا سیکھ لے۔ بچے کی فطرت، قدرت نے جس ڈھنگ سے اسے بنایا ہے، وہ اسے آزاد اور خود مختار بننے کی طرف لے جاتی ہے۔ اس فطرت کا بنیادی محرک سوال کرنا ہے۔ بچہ اپنے اردگرد کسی بھی انسانی یا مادی صورت حال کو دیکھ کر متجسس ہوتا ہے اور اس تجسس کی تسکین کے لیے وہ سوال کرتا ہے۔ سوال کرنے سے جستجو کے امکانات پیدا ہوتے ہیں اور بچہ ایک نیا علم پیدا کرتا ہے۔ اسی عمل سے وہ نہ صرف انسانی و مادی عمل (Human and Physical Processes) یا صورت حال کو سمجھتا ہے بلکہ ان کے ساتھ ایک تعلق بھی قائم کرتا ہے۔ اسی تعلق کی بنیاد پر اس کا اپنی ذات سے متعلق ایک خود مختارانہ شعور پیدا ہوتا ہے۔

خود مختارانہ شعور ذات، تحکمانہ نظام کے لیے سخت خطرے والا معاملہ ہے۔ اس فطری روش کو روکنے اور معاملات کو ہو بہو قبول کرنے کے لیے اس بات کو یقینی بنایا جاتا ہے کہ بچے میں سوال کرنے کی اہلیت کو ختم کر دیا جائے۔ گھر میں سوال کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ سوال کرنے کو بدتمیزی اور گستاخی کے برابر جرم قرار دیا جاتا ہے۔ ایسے میں جب سوال کرنے اور اس سے متعلقہ جستجو کا عمل شروع ہی نہیں ہو پاتا، بچے کے ذہن میں سوالات پیدا ہونا بند ہو جاتے ہیں۔ یہی نہیں، وہ سوالات نہ کرنے اور بڑوں کی کہی باتوں کو ہو بہو مان لینے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔ وہ اسے ایک متبادل رویے کے طور پر سیکھ لیتا ہے۔ سکول میں اسی مجبوری کی توسیع ہوتی ہے۔ وہاں وہ ایک ایسے سانچے میں زندگی گزارنا سیکھتا ہے، جس میں اس کی فطری صلاحیتوں کی نمو کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس طرح وہ تحکمانہ نظام میں ایک مجبور مگر کارآمد فرد کے طور پر زندہ رہنے کے ہنر سیکھ جاتا ہے۔

اگر اسی مثال کو مکمل طور پر یا جزوی طور پر الٹ دیں یعنی یہ کہ کسی بھی بچے میں فطری طور پر موجود سوال کرنے کی اہلیت کی پرورش کر دی جائے اور وہ ایک خود مختار باشعور فرد بنا دیا جائے تو سوچیں کہ وہ تحکمانہ نظام کے دیگر شعبوں یعنی گھر اور دفتر میں کیسے گزارہ کر پائے گا۔ کیا وہ تحکمانہ نظام کی پروردہ بیوی کے ساتھ زندگی گزار سکے گا؟ کیا وہ دفتر میں اپنے افسر کی حاکمیت میں خوش رہ

سکے گا؟ ایسا فرد سماجی طور پر عدم قبولیت کا شکار ہو جائے گا۔

IV

بے بسی کی تربیت دراصل کسی بھی فرد کو ایک مخصوص شعوری سانچے میں مقید کر دیتی ہے۔ جب یہ زندگی کے ہر پہلو اور تہہ در تہہ ہر سطح پر موجود ہو تو یہی زندگی کا اصول سمجھ لی جاتی ہے۔ بے بسی کی تربیت کے بارے میں اس تجربے سے مزید وضاحت ہوگی۔ یہ تجربہ سکھائی گئی بے بسی (Learned Helplessness) سے متعلق ہے اور اسے کتوں پر کیا گیا۔ ❶

ایک کتے کو ایک چھوٹے سے کمرے میں رکھا گیا۔ اس کمرے کے درمیان میں ایک چھوٹی سی دیوار تھی۔ کتے کو بجلی کا جھٹکا دیا گیا۔ کتا فوراً درمیانی دیوار پھلانگ کر دوسری طرف چلا گیا۔ تجربے کے دوسرے مرحلے میں درمیانی دیوار کو بند کر دیا گیا۔ کتے کو پھر بجلی کا جھٹکا دیا گیا۔ وہ بہت تلملایا اور اس نے دیوار کے اس پار بھاگنے کی کوشش بھی کی۔ اسے مزید دو تین جھٹکے دیے گئے۔ آہستہ آہستہ کتے نے فرار کی کوشش کم کر دی بلکہ بے بسی کے عالم میں بجلی لگنے کے باوجود چپکا بیٹھا رہا۔

تجربے کے تیسرے حصے میں ان کتوں کو کمرے میں لایا گیا، جن کو پہلے بجلی کے جھٹکے نہیں دیے گئے تھے۔ کمرے کی درمیانی، مکمل دیوار کو ہٹا دیا گیا۔ اب چھوٹی دیوار موجود تھی۔ ان کتوں کو بجلی کے جھٹکے دیے گئے۔ سب کتے جھٹکا لگتے ہی جان بچانے کے لیے، دیوار کے پار چلے گئے۔ پہلے والے کتے کو پھر اس کمرے میں لایا گیا۔ اسے پھر بجلی کا جھٹکا دیا گیا۔ کمرے کے درمیان رستہ موجود تھا مگر اس کے باوجود اس کتے نے دوسری طرف بھاگنے کی کوشش نہ کی۔ وہ بے بسی میں رہنا سیکھ چکا تھا۔

بے بسی سیکھ لینے کے بعد لاتعلقی (Indifference) پیدا ہوتی ہے۔ یہ انفرادی بھی ہے اور

❶ یہ تجربہ ڈاکٹر سیمیں عالم (شعبہ اطلاقی نفسیات) پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ساتھ ایک گفتگو میں سنا اور سمجھا گیا۔

اجتماعی بھی۔ مثال کے طور پر لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ کسی بھی حکومت کے بنانے میں عوام کی مرضی لازماً شامل ہونی چاہیے۔ عوام کی مرضی شامل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ حکومت میں شامل نمائندوں کو عوام منتخب کریں۔ انتخاب کا طریقہ یہ ہے کہ جس شخص کو عوام زیادہ ووٹ دیں گے، وہی ان کا نمائندہ ہوگا اور وہ حکومت میں جا کر ان کی خواہشات کے مطابق پالیسیاں بنائے گا۔ مثال کے طور پر ملک میں چار دفعہ ووٹ ڈالے گئے۔ چاروں دفعہ حکومتیں بنیں مگر عوام نے دیکھا کہ اوّل تو وہ جسے اپنا نمائندہ بنانا چاہتے ہیں وہ شخص حکومت میں جاتا ہی نہیں۔ اس کی جگہ کسی اور کو ان کا نمائندہ بنا دیا جاتا ہے۔ پھر جو بھی حکومت بنے، اس سے ان کی زندگی میں موجود تلخیوں میں تو کوئی کمی نہیں آتی۔ جب یہ عمل مسلسل ہوگا تو لوگ اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ سمجھ لیں گے کہ حکومت سازی کے موجودہ عمل کے سامنے وہ بے بس ہیں۔ ان کے ووٹ دینے یا نہ دینے سے کچھ فرق نہیں پڑتا —— وہ اس عمل سے لاتعلق ہو جائیں گے اور ووٹ کے لیے جانا ہی چھوڑ دیں گے۔

یہی نہیں، چونکہ حکومتی ادارے ایک تسلسل کے ساتھ عام لوگوں کے لیے اطمینان بخش حیثیت نہیں رکھتے، عوام نے ان کے سامنے اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنا سیکھ لیا ہے۔ اسی سیکھی گئی بے بسی کی وجہ سے لاتعلقی پیدا ہوئی اور حکومتی اداروں پر اعتبار نہ رہا۔ اسی بے اعتباری کی فضا میں رشوت کی گنجائش پیدا ہوئی۔ اگر آپ کو پتا ہے کہ کسی بھی محکمے سے آپ کی ضرورت آسانی سے پوری نہیں ہو سکتی اور اس کے لیے آپ کو سخت دقتوں سے گزرنا پڑے گا۔ یعنی آپ کو یہ اعتبار نہیں کہ یہ محکمے آپ کی خدمت کے لیے ہیں، اور یہ بھی کہ اگر آپ اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے کسی محکمے کی منظوری کے محتاج ہیں تو آپ رشوت دے کر اپنا معاملہ ٹھیک کروا لیں گے۔ رشوت خوروں کا نظام بھی اسی لیے بنتا ہے کیونکہ وہ اس نظام کی کارکردگی کو اصلاً با اعتبار نہیں سمجھتے بلکہ ان کا وجود ہی اس بے اعتباری کی شہادت ہوتا ہے۔ اگر محکمے صحیح معنوں میں عوام کے لیے ہوں تو پھر عوام کا ان پر اعتبار ہوگا۔ اگر انھیں اعتبار ہو کہ ان کی ضرورت ایک طریقے پر چلنے سے پوری ہو جائے گی تو وہ کسی کو رشوت کیوں دیں۔ رشوت کا نظام دراصل کسی بھی محکمے میں متبادل گنجائش پیدا کرتا ہے جس

کی بنیاد محکمے کی بے اعتباری پر ہوتی ہے۔

بے بسی سے لاتعلقی پیدا ہوتی ہے۔ مجبور شخص لاتعلقی میں اپنے اردگرد وسیع تر انسانی اور مادی زندگی سے تعلق کو محدود کر کے اپنے لیے آسان اور قابلِ رسائی (Accessible) مقاصد کو اپنا ہدف بنا لیتا ہے۔ یہ لاتعلقی انسانی رشتوں اور فرد کے اداروں کے ساتھ رشتوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ فرد انسانی رشتوں میں بندھا تو ہوتا ہے مگر ان سے قدرتی اور تسکین بخش وابستگی (Attachment) محسوس نہیں کرتا۔

اداروں کے بغیر زندگی گزارنا محال ہے اس لیے ان اداروں میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے متبادل طریقے بنائے جاتے ہیں۔ یہ طریقے بظاہر غیر سماجی (Asocial) نظر آتے ہیں مگر دراصل اپنی ترکیب اور افادیت کے حساب سے عین سماجی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر رشوت، سفارش اور دیگر بدعنوانیاں۔

لاتعلقی کے رجحان کو روکنے کے لیے تحکمانہ نظام میں ایک اہم طریقہ رکھا گیا ہے۔ اسے جزوی پذیرائی (Partial Re-inforcement) کہا جاتا ہے۔

سیکھنے کے عمل میں پذیرائی (Re-inforcement) کا عمل بڑا اہم ہوا ہے۔ اس سے اس بات کی تسلی کی جاتی ہے کہ سیکھنے کا عمل اپنی درست نہج پر چل رہا ہے۔ اس سلسلے میں آپ زارا کی مثال لیں۔ اس کی ماں اسے ایک وفادار بیوی اور سگھڑ ماں کے ہنر سکھانا چاہتی ہے۔ سیکھنے کے عمل میں یقیناً وہ زارا کے کام کی تعریف بھی کرتی ہوگی۔ جہاں ضرورت ہو وہاں سرزنش بھی کرتی ہے بلکہ اس نے سرزنش کچھ زیادہ ہی کر دی تو زارا کو عدم تحفظ کا احساس شروع ہو گیا۔ پذیرائی اور شاباش، اگر جزوی ہو جائے تو کوئی بھی فرد سیکھنے کے عمل یا کسی بھی کام کے کرنے میں جتا رہتا ہے۔ اس معاملے کو کبوتروں پر کیے تجربات سے ثابت کیا گیا ہے۔ ❷

❷ ایضاً

چھوٹی بہو کہتی ہے مگر اس کا خاوند جواب دیتا ہے:

''چھوڑ یہ سب باتیں، تم بھی حویلی کی دیگر بہوؤں کی طرح زیور بنواؤ، زیور تڑواؤ اور پھر بنا کر تڑواؤ۔۔۔''

جزوی پذیرائی کا ایک اور پہلو بے بسی میں رہتے ہوئے اپنے حاکم پر مکمل انحصار (Dependance) کرنا ہے۔ بچے کی تربیت میں ماں باپ یا استاد، بچے کو آزادانہ سیکھنے کی تربیت نہیں دیتے۔ تربیت کے دوران جو ماحول بنایا جاتا ہے، اس میں انحصار مکمل طور پر سکھانے والے پر ہونا لازم ہے۔ یعنی یہ کہ بچہ اپنے طور پر خود مختاری سے کچھ نہیں سیکھ سکتا۔ وہ ہر بات میں باپ، ماں یا استاد کی پیروی کرتا ہے۔ یہ سخت محبوس صورت حال ہوتی ہے مگر بچہ ان سکھانے والوں کی ہلکی سی ستائش اور شاباشی پر کھِل اٹھتا ہے۔ وہ پذیرائی کو پانے کے لیے اور محنت کرتا ہے۔ یعنی محتاجی پیدا کرنے والے سیکھنے کے عمل میں مزید اتر جاتا ہے اور اس سے اس کی آزادی مزید شل ہو جاتی ہے۔ وہ فرمانبردار بن کر شاباش لینے کو اپنی تسکین کا مقصد بنا لیتا ہے۔

تحکمانہ انتظامی ڈھانچوں میں حکومتیں بھی جزوی بہبود کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر معاشی نظام سے باہر رہنے والے غربا کو خیرات یا وظیفے دے کر 'خوش' رکھا جائے گا مگر ان کو اپنی اقتصادی حالت بہتر کرنے کے لیے مساوی مواقع مہیا نہیں کیے جائیں گے۔ اگر دیہی مزدور قلاش ہیں تو ان کی روزی روٹی کا بندوبست مستقل طور پر یہ ہو سکتا ہے وہ تکنیکی مہارت حاصل کر لیں۔ اس طرح وہ کسی کی محتاجی کے بغیر، وسائل پیداوار بڑھا لیں گے۔ انھیں سخاوت کا محتاج بنانا دراصل انھیں محتاج بنا کر حکومت کا زیر دست رکھنا ہے۔ تاریخی طور پر یہ بات مسلمہ ہے کہ قدیم دور سے ہی ہر حکومت آبادی کے ایک بڑے حصے کو اپنا محتاج رکھنا اور انھیں پسماندہ بنانا اپنا فرض اولین سمجھتی رہی ہے۔ اس پسماندگی میں آبادی کی تقسیم اس طرح سے کی جاتی کہ نچلے طبقے کم سے کم وسائل پر گزارہ کرنے کی تگ و دو میں پھنسے رہیں۔ طبقوں کے درمیان حائل فصیل کو پھلانگنے کی گنجائش نہیں ہوتی اور نہ ہی ایسا کرنے کے مواقع ان کے لیے میسر ہوتے ہیں۔

اگر کوئی فرد حالات کے سامنے اپنے آپ کو بے بس محسوس کر لے، وہ اس بے بسی میں رہنے سے لاتعلق بھی نہ رہ سکے اور دل کی تسلی کے لیے جزوی پذیرائی پر انحصار کرنا شروع کر دے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ یہ سب حالات پیدا کرنے والے نظام کا محتاج بن کر رہ گیا۔ یہ اگرچہ ٹھوس معاملات میں رہنے اور ٹھوس حقیقتوں سے سمجھوتے کی بات ہے مگر اپنی ساخت میں یہ مجرد صورت حال ہے۔ یہ صورت حال انسانی فطری مزاج کے حوالے سے حقیقی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی فطری مزاج کے اردگرد پابندیوں اور حدود کی تہہ در تہہ فصیلیں بنا دی گئی ہیں۔ فطری زندگی میں ایک قدرتی پن (Spontaniety) ہوتا ہے اور رسمیت کی گنجلک بھول بھلیاں نہیں ہوتیں۔ رسوم دراصل اسی فطرت کو سدھانے کے لیے لازم ہوتی ہیں۔

V

متشدد اخلاقی ضابطوں کی قبولیت سے، انسانی احساس اور اردگرد کی دنیا سے لاتعلقی پیدا ہو جاتی ہے۔ متشدد اخلاقی رویے دراصل سدھانے کے طریقے ہوتے ہیں اور فرد کو مخصوص طور طریقوں میں ڈھالنے کا ذریعہ۔ ایسے متشدد رویّوں کو قبول کر لینے والا فرد زندگی میں موجود تو ہوتا ہے مگر زندگی کرنے میں اختیار اور تبدیلی سے ناشناس رہنا پسند کرتا ہے۔ اس طرح اس میں تقدیر پرستی (Fatalism) کا عنصر آ جاتا ہے۔ وہ ایک سطح پر زندگی کی ٹھوس اور تلخ صورت حال کو محسوس تو کرتا ہے مگر اس میں مداخلت کی طاقت نہیں جتا پاتا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ٹونے ٹوٹکوں، پیر پرستی، جادو کرنے اور ان سے منسلک اعتقادات کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہانی ملاحظہ کریں۔

''نوآبادیاتی نظام کے تحت جب سیاسی الٹ پھیر ہوئی تو ایک جاگیردار کی ساری جاگیریں ضبط کر لی گئیں۔ جاگیردارانہ آن بان اور رئیسانہ ٹھاٹھ والا ایک خاندان دنوں میں قلاش ہو گیا۔ نوکر چاکر، حویلیاں اور ذریعۂ آمدن سب ختم ہو گئے۔ دو وقت کی روٹی جتا پانا بھی مشکل ہو گیا۔ خاندان کے مرد حضرات نے اپنی جھوٹی شان میں کسی کی ملازمت کرنے یا مزدوری کرنے سے

انکار کردیا۔ آخر معاملہ گھر کی اشیا اور زیور بیچنے پر آیا۔ اس سے کچھ دن تو کام چلا مگر معاملہ وہیں آ رکا۔۔۔۔ دو وقت کی روٹی کے لیے کچھ تو کرنا ہی تھا، حویلی کی عورتوں نے بڑے سلیقے سے جسم فروشی شروع کر دی۔ اس سے گھر کا روٹی دال کا مسئلہ چلنے لگا۔ آخر گھر کی عورتیں ایک رئیس کے ساتھ اپنی چھوٹی بچی کا معاملہ طے کرتی ہیں۔ یہ بظاہر شادی تھی مگر دراصل بچی کا سودا کیا جارہا تھا۔ گھر میں سب کو معلوم تھا کہ یہ بچی بیچی جارہی ہے۔ آخر بچی کو، جو کسی اور کو پسند کرتی ہے کو بہلا پھسلا کر 'فروخت' کر دیا جاتا ہے۔ اس صورت حال میں بڑی بہن سے منجھلی بہن پوچھتی ہے:

''ہم سے بھولے سے کوئی غلطی تو نہیں ہو رہی ہے۔۔۔؟''

''اگر غلطی ہو بھی رہی ہے تو اس کے کفارے کے لیے پیر بابا کی قبر پر ایک چادر چڑھا دیں گے۔۔۔''

آخر، جب چھوٹی بہن کو پوری صورت حال کا پتہ چلتا ہے تو وہ اپنی کلائیوں کی رگوں کو کاٹ کر خودکشی کر لیتی ہے۔۔۔

تقدیر پرستی کی قبولیت کی وجہ یہ بھی ہے کہ زندگی کی تلخیوں کو کم کرنے میں جو متبادل فکری اور مادی امداد چاہیے، وہ میسر نہیں آتی۔ مثال کے طور پر اوپر دی گئی کہانی میں جو بچی خودکشی کرتی ہے، اگر وہ اپنے بکنے پر سمجھوتہ کر لیتی اور اس اذیت ناک احساس کے ساتھ زندہ رہنا شروع کر دیتی تو اس کے سامنے تین باتیں ہو سکتی تھیں۔ ایک یہ کہ وہ اس کے خلاف لڑتی۔ لڑنے کے لیے وہ کس سے مدد مانگتی؟ ان عزیزوں سے جنھوں نے اسے خود بیچ ڈالا۔ معاشرے سے، جو خود عورتوں کو انسانی وقار دینے سے قاصر ہے۔ لڑنے کے لیے، اسے معاشرے میں موجود عورتوں سے متعلق تمام تصورات سے یکسر الٹ رویہ اختیار کرنا پڑتا۔ اس سلسلے میں وہ بالکل تنہا ہو جاتی۔ وہ پاگل ہو سکتی تھی اور اس پاگل پن میں معاشرے کے جبر سے بے نیاز ہو جاتی۔ دوسرا راستہ بکنے کے بعد کی صورت حال سے سمجھوتہ تھا اور ایسے میں وہ اپنے ساتھ ہونے والے جرم کو اپنی تقدیر سمجھ کر اس

ظلم کو قبول کر کے زندگی گزار لیتی۔ تیسری صورت احتجاج تھا، جو اس نے اپنی جان پر تشدد کر کے خودکشی کی صورت میں کر دیا۔

اس بچی کی کہانی ایسی انوکھی بھی نہیں۔ ہمارے ہاں اکثر بچیوں کو شادی کے بعد اپنے خاوند اور اعزہ کے رویے سے یہی لگتا ہے کہ وہ ان کی غلامی میں دے دی گئی ہیں۔ وہ بھی اس بچی کی طرح اذیت میں زندہ رہتی ہیں۔ وہ اس اذیت سے بھاگ نہیں سکتیں اور عام طور پر تقدیر پرست ہو کر اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر دیتی ہیں۔ تقدیر پرستی کے لیے، انھیں ایک بنا بنایا نظام مل جاتا ہے، جس میں سوچنے کی دقت بھی نہیں اٹھانا پڑتی۔ وہ اپنی تمام اذیتوں کو جو زندگی میں دوسروں کے رویّوں سے پھوٹتی ہیں، ایک مجرد جہان میں لے جا کر، کسی اور کو سونپ کر، خود اس سے الگ ہو جاتی ہیں۔ اس طرح تحکمانہ نظام انھیں استعمال کر لیتا ہے اور وہ استعمال ہو کر بھی اس نظام کو کوئی گزند پہنچائے بغیر گزراوقات کر لیتی ہیں۔

انسان کی فطری خوبی ہے کہ وہ جن حالات میں رہتا ہے، ان کو اپنی ذات کے حوالے سے سمجھتا ہے۔ اسی تناظر میں اس کا اپنی ذات سے شعور سنورتا ہے۔ اگر انسان کو سدھا کر، حالات کی بندشوں اور زندہ رہنے کے محدود وسائل میں بے بس اور محتاج کر دیا جائے تو وہ اس صورت حال میں (اپنی ذات کے شعور کے حوالے سے) یہ بات ہمیشہ محسوس کرے گا کہ 'وہ اپنے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا۔ اس میں اہلیت ہی نہیں کہ وہ اپنی زندگی کو بہتر بنا سکے۔ وہ نالائق ہے، ناقص العقل ہے اور نہ جانے کیا کیا۔۔۔' یہ باتیں ایک فرد اپنی تربیت اور زندگی گزارنے کی تگ و دو سے سیکھتا ہے۔ یہ اس کے سیکھے ہوئے شعور کی وجہ سے ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی بھی فرد پر اس کی سیکھی ہوئی تربیت، جو اس کی فطرت سے سراسر منافی ہو، کا اثر ایک حقیقی فطرت کی صورت میں ڈھل جائے۔ قدرت نے جو فطرت، انسان کو دی ہے، اصل شعوری بنیاد وہی ہے۔ سدھانے سے سیکھی ہوئی باتیں اور بننے والا شعور بہر طور غیر فطری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی تھوڑی سی گنجائش ملی، تحکمانہ نظام کے متوازی انسان دوست تحریکات اور مثالیں مسلسل بنتی رہیں۔

5

ناقدانہ شعور

'آپ خواہ اس پر یقین کریں یا نہ کریں، لیکن یہ کہنے پر مجھے معاف فرمائیے گا کہ آپ کی رائے میرے نزدیک ذرا بھی اہمیت نہیں رکھتی۔ میرے لیے اتنا کافی ہے کہ میں نے اسے دیکھا، اس سے ملا، اس سے بات کی اور اپنی آنکھوں سے کرسی کا مشاہدہ کیا۔

۔۔۔ یہ ایک بہت بڑی کرسی تھی۔ اسے دیکھ کر آپ کو گمان ہوا ہوتا کہ یہ کسی اور دنیا سے آئی ہے، یا یہ کہ کسی بہت بڑے جلسے کے لیے اس عظیم الشان کرسی کو خاص طور پر تیار کیا گیا ہے۔ چیتے کی کھال اور ریشمیں تکیوں سے ڈھکی ہوئی وسیع وعریض نشست کے ساتھ یہ اپنے آپ میں ایک ادارہ معلوم ہوتی تھی۔ ایک بار اسے دیکھ لینے کے بعد آپ کی عزیز ترین خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس پر بیٹھ سکیں۔ ایک بار، صرف ایک لمحے کے لیے ہی سہی۔ کرسی متحرک تھی، شاہانہ وقار سے آگے کی سمت یوں حرکت کر رہی تھی گویا کسی مذہبی جلوس میں چل رہی ہو۔ آپ کو خیال ہوتا کہ کرسی خود بخود حرکت میں ہے۔ استعجاب اور ہیبت میں آپ اس کے سامنے سجدے میں گر پڑتے اور اس پر قربانیوں کی نذریں گزارنے لگتے۔

لیکن بالآخر مجھے کرسی کے جسیم، چمکتی دھات کے نعلوں جڑے پایوں کے درمیان پانچویں پائے کی جھلک نظر آئی۔ یہ پایہ باقی چار پایوں کے مقابلے میں بے حد پتلا تھا اور جسامت اور شان وشکوہ کے اس مظہر کے درمیان عجیب اور بے محل لگ رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ کوئی پایہ نہیں بلکہ ایک نحیف ونزار انسان تھا جس کے بدن پر پسینے کے بہتے رہنے سے موریاں اور نالیاں سی بن گئی تھیں

اور سر پر بالوں کے جنگل اُگ آئے تھے۔ مجھ پر یقین کیجیے، میں کسی بھی متبرک چیز کی قسم کھانے کو تیار ہوں، میں نہ جھوٹ بول رہا ہوں اور نہ مبالغہ کر رہا ہوں، میں تو اَن گھڑ طریقے سے وہی بیان کر رہا ہوں جو میں نے دیکھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ دبلا پتلا، کمزور آدمی ایسی عظیم الجثہ کرسی کو اٹھائے لیے جا رہا تھا، جس کا وزن زیادہ نہیں تو ایک ٹن ضرور ہوگا؟ ذہن میں اس کی ایک ہی توجیہہ آتی ہے: یہ کس طرح کی شعبدہ بازی ہے۔ لیکن آپ تھوڑی دیر تک اور ذرا قریب سے اس کا مشاہدہ کرتے تو معلوم ہوتا کہ اس میں کوئی فریب نہیں، کہ آدمی نہ صرف اس کرسی کو واقعی اٹھائے ہوئے ہے بلکہ اسے لے کر آگے بڑھ رہا ہے۔

جو بات اس سے بھی زیادہ غیر معمولی اور پُر اسرار اور واقعی بے حد چونکانے والی تھی، وہ یہ کہ میدان الاوبرا، شارع جمہوریہ میں، بلکہ پورے قاہرہ میں، ایک بھی راہگیر ایسا نہ تھا جسے اس بات نے حیران کیا ہو یا جس نے اس واقعے کو ذرا بھی غیر معمولی سمجھا ہو۔ وہ سب اسے ایسی عام سی، معمولی بات سمجھ رہے تھے گویا یہ کرسی نہیں بلکہ کوئی تتلی ہو جسے کوئی چھوٹا سا لڑکا لیے چلا جا رہا ہو۔ میں نے لوگوں کی طرف دیکھا اور پھر کرسی اور اس آدمی پر نظر ڈالی، یہ سوچ کر کہ شاید میں کسی اٹھے ہوئے ابرو یا حیرت سے دبے ہوئے ہونٹ کی جھلک پا سکوں، یا استعجاب کی ہلکی سی چیخ سن سکوں۔ لیکن کسی ردّعمل کا کوئی نشان نہ پایا۔

مجھے یہ تمام معاملہ اس قدر ہولناک محسوس ہونے لگا کہ مزید ایک لمحہ اس پر نظر جمائے رکھنا دشوار ہو گیا۔ عین اسی لمحے اس عظیم بوجھ کو اٹھائے ہوئے وہ آدمی مجھ سے ایک آدھ قدم کی دوری پر تھا، اور میں جھریوں کے باوجود اس کے چہرے کی نیک باطنی کو دیکھ سکتا تھا۔ مگر اس کی عمر کا اندازہ لگانا ناممکن تھا۔ تب میں نے اس کے جسم پر نظر ڈالی: وہ کمر میں بندھی ہوئی ڈوری اور آگے پیچھے اس پر سے لٹکتے ہوئے بادبانی کپڑے کے چیتھڑے کے سوا بالکل برہنہ تھا۔ اس کے باوجود اس کو دیکھ کر اس انکشاف پر آپ کے قدم تھم جاتے کہ یہ شخص نہ صرف قاہرہ شہر میں، بلکہ ہمارے پورے دور میں اجنبی تھا۔ آپ کو خیال ہوتا کہ اس شکل وصورت کے لوگ آپ نے تاریخ یا آثار قدیمہ کی

کتابوں میں دیکھے ہیں۔ اس لیے مجھے سخت حیرت ہوئی جب اس نے، کسی گداگر کے سے مسکین انداز میں مسکرا کر مجھے دیکھا اور عجیب سی آواز میں منہ ہی منہ میں بولا:

''بیٹے، تمھارے ماں باپ پر مہربانی ہو، تم نے کہیں پتاہ رع (ایک دیوتا) کو تو نہیں دیکھا۔۔۔؟''

کیا وہ قدیم تصویری زبان کو عربی اصوات میں ادا کر رہا تھا یا عربی کو تصویری زبان میں؟ کیا یہ شخص کوئی قدیم مصری تھا؟ میں اس کی طرف مڑا:

''سنو، مجھ سے یہ مت کہنا کہ تم قدیم مصری ہو۔''

''کیا قدیم اور جدید بھی ہوتے ہیں؟ میں مصری ہوں۔''

''اور یہ کرسی کیا ہے؟''

''یہ وہ ہے جسے میں نے اٹھا رکھا ہے۔ تمھارے خیال میں مَیں پتاہ رع کو کیوں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں؟ اس لیے کہ شاید وہ مجھے اس کرسی کو اتار کر نیچے رکھنے کا حکم دے، جس طرح اس نے مجھے اس کو اٹھانے کا حکم دیا تھا۔ میں تھک کر چور ہو گیا ہوں۔''

''کیا تم بہت دیر سے اسے اٹھائے ہوئے ہو؟''

''بہت دیر سے —— تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''ایک سال؟''

''ایک سال سے تمھاری کیا مراد ہے، بیٹے؟ کوئی پوچھے تو اس سے کہنا، ایک سال اور چند ہزار۔''

''ہزار کیا؟''

''سال۔''

''مثلاً اہرام کے زمانے سے؟''

''اس سے بھی پہلے سے —— نیل کے زمانے سے''

''نیل کے زمانے سے؟ کیا مطلب؟''

''اس زمانے سے جب نیل کو نیل نہیں کہا جاتا تھا، اور مرکز کو پہاڑوں سے دریا کے کنارے پر منتقل کیا گیا تھا۔ تب پتاہ رع نے مجھے بلایا اور کہا: حمال، اسے اٹھالے۔ میں نے اسے اٹھا لیا اور اس وقت سے اٹھائے اٹھائے پھر رہا ہوں اور پتاہ رع کو ڈھونڈ رہا ہوں تا کہ وہ مجھے اس کو اتارنے کا حکم دے، مگر اس دن سے اب تک وہ مجھے دکھائی نہیں دیا۔''

استعجاب کی صلاحیت یا خواہش مجھ میں بالکل ختم ہو چکی تھی۔ جو شخص اس جسامت یا وزن کی کرسی کو ایک لمحے کے لیے بھی اٹھانے پر قادر ہو، وہ اسے ہزاروں سال بھی اٹھائے پھر سکتا ہے۔ تعجب یا احتجاج کا یہ کوئی موقع نہ تھا۔ صرف ایک سوال کیا جا سکتا تھا:

''اور فرض کرو تمھاری پتاہ رع سے ملاقات نہ ہو سکے، تو کیا تم اسے اٹھائے گھومتے رہو گے؟''

''اور کیا کروں؟ میں نے اسے اٹھا رکھا ہے اور اسے میرے سپرد کیا گیا ہے۔ مجھے اس کو اٹھانے کا حکم دیا گیا تھا، تو میں حکم کے بغیر کیوں کر اسے اتار سکتا ہوں؟''

شاید یہ غصے کی لہر تھی جس سے مغلوب ہو کر میں نے کہا: ''اسے اتار دو۔ کیا تمھارا جی نہیں بھرا؟ بندۂ خدا، تم تھکتے نہیں؟ پھینک دو اسے، توڑ ڈالو، جلا دو۔ کرسیاں اس لیے بنائی جاتی ہیں کہ یہ لوگوں کو اٹھائیں، نہ کہ لوگ انھیں اٹھائے پھریں۔''

''میں ایسا نہیں کر سکتا۔ کیا تمھارے خیال میں مَیں اسے تفریح کی غرض سے اٹھائے پھر

رہا ہوں؟ میں اپنی روزی اسی طرح کماتا ہوں۔''

''تو کیا ہوا؟ جب تم دیکھ رہے ہو کہ یہ تمھیں تھکا کر چور کر رہی ہے، تمھاری کمر توڑے دے رہی ہے، تو تمھیں اس کو اتار پھینکنا چاہیے —— تمھیں تو یہ کام زمانوں پہلے کر لینا چاہیے تھا۔''

''تم تو ایسا ہی کہو گے، کیونکہ تم اس قصے سے باہر اور محفوظ ہو۔ اس کا بوجھ تمھارے سر پر نہیں ہے، تو تمھیں کیا پرواہ؟ اسے میں نے اٹھا رکھا ہے کیونکہ اسے میرے سپرد کیا گیا تھا، اس کی ذمے داری مجھ پر ہے۔''

''خدا کی پناہ، مگر آخر کب تک؟''

''جب تک پتاہ رع مجھے حکم نہ دے۔''

''وہ کب کا مر کھپ چکا۔۔۔۔''

''تو اس کا وارث، اس کا نائب، اس کا کوئی خلف، کوئی بھی شخص جسے اس کی طرف سے اس کا اختیار حاصل ہو۔''

''تو ٹھیک ہے، میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ اسی وقت اسے نیچے رکھ دو۔''

''تمھارے حکم کی تعمیل ہوگی —— اور تمھاری دردمندی کا بھی بے حد شکریہ —— لیکن کیا تم اس کے خاندان سے ہو؟

''بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے۔''

''نہیں۔''

''تو پھر مجھے میری راہ جانے دو۔''

اس نے چلنا شروع کر دیا تھا، لیکن میں نے چلا کر اسے روک لیا کیونکہ میری نظر اس شے پر

پڑ گئی تھی جو ایک اعلان کی شکل میں کرسی کے سامنے والے حصے پر چسپاں تھی۔ درحقیقت یہ ہرن کی کھال کا ایک ٹکڑا تھا جس پر قدیم رسم الخط میں کوئی عبارت درج تھی اور وہ آسمانی کتابوں کے اوّلین نسخوں کی طرح لگ رہا تھا۔ میں بہت دشواری سے یہ عبارت پڑھ سکا:

'اے کرسی بردار

بہت دیر تو نے یہ بوجھ اٹھایا

اور اب وقت آ گیا ہے کہ کرسی تیرا بوجھ اٹھائے

یہ عظیم و جسیم کرسی

جس کی نظیر کبھی تیار نہیں ہوئی

تیرے ہی لیے ہے

اسے اٹھا لے

اور اپنے گھر لے جا

اسے کسی ممتاز مقام پر رکھ

اور عمر بھر اس پر نشست کر

تیرے دنوں کے خاتمے پر

یہ تیرے بیٹوں کی ملکیت ہے۔'

''میرے برادر، کرسی بردار، یہ پتاہ رع کا فرمان ہے، اس کا واضح حکم جو اسی وقت جاری ہوا تھا جب اس نے تمھیں کرسی اٹھانے کا حکم دیا تھا۔ اس پر اس کے دستخط ہیں۔ اسے اس کے خرطوشے سے مہر کیا گیا ہے۔''

میں نے یہ سب اس سے بے حد مسرت کے عالم میں کہا، کسی ایسے شخص کی سی مسرت جو طویل حبس سے باہر آیا ہو۔ جس لمحے سے میں نے کرسی کو دیکھا تھا اور یہ قصہ سنا تھا، میں یوں محسوس کر رہا تھا گویا یہ بوجھ مجھی پر ہے اور ہزاروں سال سے مجھی پر رہا ہے؛ گویا وہ میری ہی کمر ہے جو ٹوٹی جا رہی ہے، اور جو مسرت مجھ پر طاری ہے وہ اس بوجھ سے بالآخر رہا ہو جانے پر میری اپنی مسرت ہے۔

وہ شخص سر جھکائے میری بات سنتا رہا، کسی جذبے کی ایک رمق تک سے عاری، وہ فقط سر جھکائے میری بات پوری ہونے کا انتظار کرتا رہا، اور جیسے ہی میں نے اپنی بات ختم کی اس نے اپنا سر اٹھایا۔ میں اس میں اپنی جیسی مسرت، بلکہ سرخوشی کے اظہار کی توقع کر رہا تھا، لیکن مجھے کوئی ردِ عمل دکھائی نہ دیا۔

''یہ فرمان ٹھیک تمھارے سر کے اوپر لکھا ہوا ہے — بہت زمانوں سے۔''

''مگر میں تو پڑھنا نہیں جانتا''

''مگر میں نے تمھیں پڑھ کر سنا دیا ہے۔''

''میں تمھاری بات پر یقین کر لیتا اگر تمھارے پاس اختیار نامہ ہوتا۔۔۔۔ ہے تمھارے پاس۔۔۔؟''

جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ غصے سے کچھ بڑبڑاتا ہوا جانے کو مڑا:

''لوگوں کو بلاوجہ راہ کھوٹی کرنے کے سوا کوئی کام نہیں۔ اس قدر بھاری بوجھ ہے اور دن بھر میں ایک چکر بھی پورا نہیں ہو پاتا۔''

میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ کرسی اپنی سست اور ہموار رفتار سے حرکت کرنے لگی تھی، جسے دیکھ کر لگتا تھا کہ خود بخود حرکت میں ہے۔ وہ شخص ایک بار پھر اس کا پانچواں پایہ بن گیا تھا جس کے بل پر

کرسی متحرک تھی۔

میں کھڑا، اسے پسینے سے تر ہوتے، ہانپتے اور کراہتے ہوئے دور جاتے دیکھتا رہا۔

میں گنگ کھڑا تھا، خود سے سوال کر رہا تھا کہ آیا مجھے دوڑ کر اسے جالینا اور مار ڈالنا چاہیے، تاکہ اپنے غضب کا اظہار کر سکوں۔ کیا مجھے دوڑ کر کرسی کو زبردستی اس کے کندھوں پر سے دھکیل کر نیچے گرا دینا چاہیے اور اسے آرام کرنے کے لیے بٹھا دینا چاہیے؟ یا مجھے اس کے لیے صرف طیش آمیز جھنجھلاہٹ پر اکتفا کرنا چاہیے؟ یا مجھے اپنے غیظ پر قابو پا کر اس کے لیے صرف تأسف کرنا چاہیے؟

یا پھر مجھے اس بات کے لیے خود کو قصوروار ٹھہرانا چاہیے کہ مجھے علم نہیں کہ اختیار نامہ کیا ہوتا ہے؟

(مصری ادیب یوسف ادریس کی کہانی 'کرسی بردار' ترجمہ اجمل کمال۔ عربی کہانیاں 2002ء)

یہ کہانی ہم سب انسانوں کی ہزاروں سالہ مجبوری کا علامتی اظہار ہے۔ کہانی سے یہ باتیں واضح ہو جاتی ہیں:

i- مجبوری کا معاملہ ایک دو سالوں کی بات نہیں وسیع معنوں میں تاریخی ہے اور اس لحاظ سے آج کے، زندہ فرد کا شعور بھی تاریخی ہے۔ اس لحاظ سے ہر فرد ایک تاریخی ذات (Historical Being) رکھتا ہے۔

ii- مجبوری کے جاری و ساری رہنے کی بنیاد ناقدانہ شعور (Critical Consciousness) کا نہ ہونا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کرسی بردار، کرسی پر لکھے فرمان کے باوجود اسے اٹھائے پھر رہا ہے۔ وہ اس فرمان پر عمل کے لیے اختیار نامہ طلب کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ اس کی مجبوری اس قدر گہری ہے کہ کرسی پھینکنے کی گنجائش ہوتے ہوئے بھی، وہ بے اختیار محسوس کر رہا ہے۔ ناقدانہ شعور سے صرف آزادی ہی نہیں ملتی،

اس کے ساتھ با عمل اختیار کی اہلیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

iii- کرسی بردار، کہانی سنانے والے کی بات نہیں مانتا۔ وہ ایک تجرید یا واہمے میں رہ رہا ہے، جس کا سلسلہ ہزاروں سال پرانا ہے اور پناہ رع اس کی علامت ہے۔ یعنی تجرید کے باعث وہ اپنی ذات کو دوسرے انسانوں اور اس ناطے ماحول سے وابستہ نہیں کر پاتا۔ وہ سخت تکلیف میں ہے اور اس کے لیے کرسی کو پرے پھینک دینے کے لیے یہی جواز کافی ہے۔ مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ اس نے اپنی تکلیف کے احساس کے باوجود اسے واہمے یعنی فرضی اختیار نامے کے ساتھ منسلک کر کے، اپنے آپ کو ایک مجرد ذات (Abstract Being) میں بدل دیا ہے۔ ناقدانہ شعور کا پہلا کام اس تجرید یا واہمے کو ختم کر کے حقیقی حالات اور حالات کے درد کو دردِ آشنائی کا احساس عطا کرنا ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ تاریخ کی اس مجبوری سے ایسا ماحول پیدا ہوا، ایسے رشتے پیدا ہوئے جن کی بنیاد بے اعتباری پر تھی۔ معاشرتی اور حکومتی سطح پر ایک وسیع ساخت (Form) موجود ہے مگر اس ساخت کی روح یعنی حقیقی مقصد انسانوں کو مجبور بنانا، ان کو مجبور بنا کر استعمال کرنا اور اس سلسلے کو نسل در نسل آگے بڑھانا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ساخت کسی طور انسانوں کی فطری آزادی اور اختیار قائم کرنے کے لیے نہیں ہے اور نہ ہی یہ ساخت ایسا کرنے میں معاون ہو سکتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسانی صورت حال اس قدر لمبی اور وقیع مجبوری میں رہنے کے بعد اس قابل رہ گئی ہے کہ یہ اپنی فطری صلاحیتوں کو واپس حاصل کر لے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ایک طویل جبر میں رہنے کے بعد ہم نے جو کچھ سیکھا، وہی اب ہماری حقیقی فطرت ہے؟

کیا اس سیکھے گئے شعور (Learned Consciousness) کو اَن سیکھا (De-learn)

کر کے انسانی صلاحیتوں کو دوبارہ سیکھ (Re-learn) لینا ممکن ہے؟

کیا جابروں اور مجبوروں نے مل کر جو دنیا بنائی اس میں دونوں ہی مساوی طور پر اپنی حقیقی انسانی صلاحیتیں کھو بیٹھے؟

کیا تاریخی ارتقا میں ایسی سطح آ گئی ہے جہاں حقیقی انسانی صلاحیتوں پر مبنی ناقدانہ شعور کے برقرار رہنے کی گنجائش موجود ہے؟

II

یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انسان اور معاشرہ، ان دونوں پر نافذ کیے گئے کسی بھی حکومتی نظام جبر سے زیادہ طاقتور ہیں۔ انسان سخت سے سخت مجبوری اور جبر برداشت کر لیتے ہیں۔ وہ ایسے نظاموں میں زندہ رہنا سیکھ لیتے ہیں مگر ان کی انسانی خاصیتیں جو انھیں انسان بنانے کا ملکہ رکھتی ہیں، شدید دباؤ میں بھی برقرار رہتی ہیں۔ اس کی بنیادی دلیل یہ ہے کہ جبر کے طریقے انھی انسانی صلاحیتوں کو منفی طور پر استعمال کر کے اپنا اثر و رسوخ پیدا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر انسان میں قوتِ متخیلہ فطری طور پر موجود ہے۔ اسی قوت کی مدد سے فطرت کو سمجھا جا سکتا ہے اور انسانوں کی بہتری کے لیے ایجادات کی جا سکتی ہیں۔ دوسری طرف انھی کی مدد سے واہموں کی افزائش کی جا سکتی ہے جو انسانی شعور کو ٹھوس فطری حقیقتوں سے الگ کر کے مجرد دنیاؤں میں رہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ یعنی یہ کہ انسانی فطرت میں موجود قوتِ متخیلہ تو ہر دو صورتوں میں موجود رہی اور دونوں صورتوں میں اپنی اپنی نوعیت کی تخلیقات ہوئیں۔ انسان میں تجسس، حیرت اور انکشاف کے عمل سے مرعوب ہو جانے کی صلاحیت ہے۔ اسی کی بنیاد پر سائنسی تحقیق ہوتی ہے مگر اسی کی بنیاد پر تحکم اور تحکمانہ نظام پیدا ہوتا ہے۔

احساس وابستگی (Sense of belonging) کسی بھی فرد کی سماجی جبلت (Social Instinct) میں موجود ہوتی ہے۔ اسی جبلت کی بنیاد پر انسانوں کی بستیاں آباد ہوئیں۔

معاشرے کی ابتدائی صورت پیدا ہوئی، انسان نے انسان کے ساتھ رشتہ قائم کرنا سیکھا۔ یہی جبلت جب طاقت اور ملکیت کے احساس سے منسلک ہوگئی تو اجتماعی سطح پر جابرانہ نظام پیدا ہونے لگے۔ کوئی بھی جابر، اپنی جبریت بیابانوں میں قائم نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اپنی سماجی جبلت کے تحت انسانوں کے قریب ہی رہنا چاہتا ہے۔ اگرچہ اس کی صورت غیر انسانی ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کسی کتے کو 'کتا' کہیں تو ایسا کہنے میں کتے کی ذات اور اس کے اوصاف اپنی جگہ پر رہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ ایک انسان کو کتا کہیں تو اس صورت میں پہلے آپ کو اس انسان کو اس کے انسانی اوصاف کے ساتھ تسلیم کرنا ہوگا تبھی حقارت اور مجبوری کے معانی پیدا ہوں گے۔ (سارتر)

اصل معاملہ یہ ہے کہ تحکمانہ نظام اور مجبوری کی صورت حال اپنی ساخت اور اپنے طریقوں کے اعتبار سے انسانوں کے لیے تھی۔ اسے انسانی فطرت میں رکھتے ہوئے استعمال کیا گیا۔ انسانی فطرت کی صلاحیتیں اپنی جگہ پر موجود رہیں اگرچہ ان کا اثر انسانی صورت حال کے لیے موزوں نہ تھا۔ اس کی ایک اور اہم دلیل یہ ہے کہ ان تمام ہتھکنڈوں کے استعمال میں انسانی مزاج میں برداشت کی حدود کا خیال رکھا گیا ورنہ انسان ٹوٹ سکتا تھا۔ تحکمانہ نظام انسان کو اس کی برداشت کی آخری حدود پر رکھتے ہوئے زندہ رکھتا ہے۔ اگر مادی وسائل مہیا نہ کرے تو واہموں کے سہاروں پر جینا سکھا دیتا ہے۔ یہ سب انسان کی فطری حدود میں ہوا اور اس نظام کا تجزیہ جہاں مجبوری پھیلانے والے ہتھکنڈوں کی نشاندہی کرتا ہے، وہیں انسانی فطرت کے بہت گہرے مخفی گوشوں کو بھی واضح کر دیتا ہے۔ انھی گوشوں کے سمجھنے کے بعد تبدیلی کا عمل شروع ہوسکتا ہے۔

تحکمانہ نظام کی روایتی تاریخ میں نام سچے ہوتے ہیں مگر تاریخ سراسر جھوٹ اور واہموں کا پلندہ ہوتی ہے۔ اس کے برعکس لوک ادب میں کرداروں کے نام فرضی ہوتے ہیں مگر اس میں دی گئی کیفیات سچی اور انسانوں کی اصل کہانی بتاتی ہیں۔ یہ ہو بہو اس شعور کو ظاہر کرتا ہے جس میں دراصل لوگ بسر رہے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر بادشاہوں کے دور میں بادشاہ کی ذات سے منسلک رعب اور خُل کی کہانیاں دراصل بادشاہ کی ذات سے منسلک تحکم کی پذیرائی تھی۔ ان کی

تکرار سے اس مزاج کا اندازہ ہوتا ہے کہ جس میں ہر محکوم کی آخری خواہش حاکم جیسا ہو جانا ہوتی ہے۔ ایسی کہانیاں بادشاہ کی عظمت کی بجائے تحکمانہ مزاج کی علامات (Symptoms) ہیں۔

مجبور معاشروں کے ادب میں کردار، انسانوں کی بجائے جانوروں کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ جانوروں کی کرداری تشکیل ان کی مخصوص ذاتی خصوصیات دیتی ہیں۔ شیر، بادشاہ ہے جس کے پاس صرف طاقت ہے، رعب و دبدبہ ہے مگر عقل میں وہ لومڑی کا محتاج ہے۔ لومڑی شیر کو چکمہ بھی دے جاتی ہے اور بادشاہ بے وقوف بن جاتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو لومڑی جن ذاتی خصوصیات کی نمائندگی کرتی ہے، ان میں موقع محل کے مطابق منصوبہ بندی، احتیاط، باعمل ذہانت، زیرکی، شاطرانہ الٹ پھیر اور سخت مجبوری میں بھی اپنی ذات سے رشتہ نہ توڑنا خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ کہانیوں کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو لومڑی ہی اکثر کہانیوں کا مرکزی کردار ہوتی ہے اور وہی آخر کار کامیاب ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے لومڑی سے منسلک رویے اور اصول ہی کامیابی کی ضمانت دے سکتے ہیں۔ محنت کرنے والے جانور خاص طور پر گدھے کو بے وقوف سمجھا گیا ہے اور اس کی تصویر کشی بھی اسی حوالے سے کی گئی ہے۔ ہر کوئی اسے استعمال کرتا ہے اور ہر دفعہ گدھا اپنی بے وقوفی میں استعمال ہو جاتا ہے۔ یہ ایک لحاظ سے محنت کرنے والے کسانوں کی نمائندگی بھی ہے اور ان پر طنز بھی۔

تحکمانہ نظام زندگی کے ہر پہلو کے لیے فرد اور اداراتی سطح پر مخصوص ڈھانچے بناتا ہے۔ ان سانچوں میں بندوں کو کس کر باندھ دیا جاتا ہے۔ سانچوں کی کامیابی اور اثر پذیری کا انحصار ان میں موجود رسمیت (Formalism) اور اخلاقی ضابطوں پر ہوتا ہے۔ بادشاہوں کے دور میں ان سانچوں کی گرفت مخصوص شعبوں تک محدود رہی۔ مثال کے طور پر کسان اپنی پیداوار میں سے بادشاہ اور زمیندار کا حصہ دے دینے کے بعد ان دونوں کی گرفت سے آزاد ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی زندگی میں اخلاقی ضابطوں اور رسمیت کی گرفت کم تھی۔ اس کی زندگی میں فطری طور پر کھلا پن اور بے فکری تھی۔ وہ کسی اخلاقی نظام کی پیروی میں سرخرو ہونے کو

اپنا مقصد نہیں سمجھتا تھا۔ اس میں بنیادی محرک جیسے تیسے زندگی گزارنا ہی ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ کردار جو سماجی بندھن اور تحکمانہ سانچوں کو توڑ دے یا توڑ دینے کی سعی کرے، اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ مثلاً عاشق، جو عورت اور مرد کے درمیان محبوس رشتوں ناطوں کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے، اس لحاظ سے وہ پیار کے ذریعے انفرادی اختیار کا نمائندہ بنتا ہے۔ ڈاکو، جو اقتصادی ناہمواری کو توڑنے کی علامت ہے، کے قصے بڑے اشتیاق سے سنے جاتے ہیں۔ اکثر ڈاکوؤں کے قصے، امیروں کو لوٹنے اور غریبوں کی اعانت کرنے کے گرد گھومتے ہیں۔ اس لحاظ سے ڈاکو احتجاج کی علامت بن جاتے ہیں۔

رسمیت اور تحکمانہ اخلاقی ضابطوں کا زیادہ تر اثر شہری معاشروں پر ہوا اور جیسے جیسے حکومتی نظام کی گرفت بڑھتی گئی، لوگ اس نظام کے محتاج بنتے گئے۔ اس محتاجی کے ساتھ ساتھ حکومتی اداروں کی قبولیت کا رجحان بھی بڑھتا گیا۔ جہاں انسانوں نے مجبور بن کر رہنا سیکھ لیا، انھوں نے اپنے تجربے کی روشنی میں یہ بھی سیکھ لیا کہ حکومتی ادارے دراصل ان کی بہبود کے لیے نہیں ہیں۔ حکومتی ادارے جدید ریاستی نظام میں غیر شخصی (Depersonalized) اثر رکھتے تھے۔ کسی ذاتی مفاد یا سہولت کے لیے ان سے مدد لینا دُوبھر نہیں، ناممکن ہے۔ وہ حکومتی نظاموں کی پیچیدگی اور طوالت سے گھبرا جاتا ہے۔ اسے ان کی انصاف دینے کی صلاحیت پر اعتبار نہیں ہوتا۔ واضح رہے کہ حکومتی نظامات میں فیصلہ سازی کے لیے درجہ بدرجہ تقسیم اور پیچیدگی دراصل لوگوں کو الجھانے کا ایک طریقہ ہے تاکہ وہ حکومت کے سامنے بے بسی محسوس کریں۔ اسی تناظر میں حکومتی اثر اور حکومتی اداروں سے وابستگی کی گنجائش نکلتی ہے۔ بڑے بڑے زمیندار صنعت کار اور تاجر حکومتی اثر سے وابستگی کے لیے افسران سے تعلقات اچھے رکھنے، سیاست میں آ کر اپنا حلقہ اثر و نفوذ بڑھانے اور اپنے بچے کو بیوروکریسی میں شامل کروانے کا جتن کرتے ہیں۔ اسی بے اعتباری کی وجہ سے خوشامد اور رشوت کی گنجائش نکلی۔ اس ماحول میں حکومت عوام کی بہبود کے لیے نہیں ہوتی، صرف اس کے لیے ہے جو کسی طرح حکومتی اثر کا حصہ بن جائے۔ پھر وہ حکومتی وسائل کو ذاتی خوشیوں کے لیے دل

کھول کر استعمال کر سکتا ہے۔ جو گروہ جس سطح پر اثر قائم کرے گا، اس سطح کی حدود کے مطابق وہ حکومتی وسائل استعمال کرے گا۔

اگر زمینداروں یا صنعتکاروں کا مرکزی حکومت پر قبضہ ہو جائے تو وہ اپنے مفادات کو وسیع کرنے کے لیے حکومتی نظام کو استعمال کریں گے۔ بیوروکریسی (فوجی و سول) مستقل طور پر حکومتی ڈھانچے پر اثر قائم رکھتی ہے تاکہ وہ مستقل طور پر حکومتی اثر اور وسائل کو استعمال کر سکے۔ عوام، حکومتی اداروں سے اپنے قدیم تجربے کی بنیاد پر لاتعلق ہیں۔ مجموعی طور پر حکومتی اداروں کا داخلی مزاج چونکہ بے اعتباری یا حکومتی اثر سے قربت اور تحکم سے بنتا ہے، اس لیے اس میں متحرک افراد کا مزاج بھی بے اعتباری اور بدعنوانی پر مبنی ہوتا ہے۔

جابر اور مجبور دونوں مل کر مجبوری کا ماحول بناتے ہیں (Freire)۔ جابر، انانیت، تحکم اور احساس ملکیت جیسے غیر انسان دوست رویّوں اور محرکات کی بنیاد پر لوگوں کو مجبور بناتا ہے اور اس طرح وہ خود بھی غیر انسانی درجے پر آ کھڑا ہوتا ہے۔ اسے انھی رویوں کے پھیلانے سے تسکین ملتی ہے اور اس لحاظ سے وہ ذہنی طور پر بیمار اور اپنی تسکین کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ اسی طرح ہے کہ ایک بونا کافی دولت کما کر طاقت حاصل کر لے اور اپنی خرید لینے کی صلاحیت کو بروئے کار لا کر اپنے قد کے مطابق اپنے اردگرد ایک بونی دنیا بسا لے۔ وہ ایک بونی خاتون سے شادی کر لے، گھر میں نوکر چاکر بھی بونے رکھ لے اور گھر کا سارا ساز و سامان اپنے قد کے مطابق ہی بونا کروا لے۔ وہ بونوں کے علاوہ ہر نارمل قد والے کو نفرت سے دیکھے اور اسے اپنی توجہ کا مستحق ہرگز نہ جانے۔ بظاہر وہ نارمل قد والوں سے نفرت کر رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بونے پن سے نفرت کرتا ہے۔ وہ اپنے بونے پن کو ایک حقیقت تسلیم نہیں کرتا جو فطرت کے قوانین میں گڑبڑ کے باعث ممکن ہے۔ یہ تضاد اس وقت بڑھتا ہے جب اس کے ہاں ایک بچے کی ولادت ہوتی ہے اور اس کا قد ایک نارمل انسان کی طرح بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ بچہ، ان بونوں کی فطری توسیع تو تھی مگر قد کے معاملے میں فطرت نارمل طور پر کام کر گئی۔ وہ بونا نہ رہا جیسا کہ اس کے ماں باپ کے

ساتھ ہوا۔ چونکہ بونے کے مزاج میں بونا ہونا ہی، انسان ہونے کے مترادف تھا، نارمل بچہ اس مزاج کے سامنے ایک قدرتی ردّ مزاج کی صورت ابھر آیا۔ چونکہ بچے کی پرورش میں بونے پن سے متعلق خصوصی پہلو نمایاں تھے، اس لیے بچے نے بڑا ہو کر، قد کے حوالے اپنے ماں باپ کو بھی پرکھنا شروع کر دیا۔ اس نے اپنی تربیت سے یہ نتیجہ نکالا کہ قد کی اونچائی ہی، انسانی وجود کو پرکھنے کا بنیادی حوالہ ہے۔ اسی حوالے پر اسے معلوم ہوا کہ وہ نارمل انسان ہے اور اس کے ماں باپ دراصل بونے ہونے کی وجہ سے قدرے کم انسان۔ اس اختلاف سے بونے ماں باپ اس قدر بوکھلا جاتے ہیں کہ آخر کار خودکشی کر کے اس بونے پن سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔

(ایک انگریز مصنف کی کہانی کی تلخیص)

یہ تحکمانہ مزاج رکھنے والے جابر کی صورت حال کی کہانی ہے۔ وہ عام لوگوں کی طرح انسانی حسیات سے عاری ہوتا ہے اور اپنے انسانی بونے پن کی داخلی صورت حال کو اردگرد انسانوں میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی بونے پن کی تلخی اسے اپنی ذات میں شدید عدم تحفظ دیتی ہے اور وہ اسی عدم تحفظ کو دُور کرنے کے لیے اپنے اردگرد رُعب، طاقت اور رسمیت کی قیود پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنی ذات سے منسوب شاندار عمارات تعمیر کرتا ہے۔ ایسی چیزیں استعمال کرتا ہے جو عام لوگوں کی دسترس میں نہیں ہوتیں۔ لوگوں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کی اس آن بان کو محسوس کریں۔ وہ ہر انسان کی آنکھ میں اپنی ذات کے حوالے سے خوف کی جھلک دیکھنا چاہتا ہے۔ اس طرح اپنے آپ کو انسانوں کے اوپر حاوی کر کے، اپنی ذات کے عدم تحفظ اور غیر انسان ہونے کی شہادت حاصل کرتا ہے۔

مجبوری میں رہنا، اگرچہ دقت طلب ہے اور اس میں ذہنی حبس اور بے اختیاری محسوس ہوتی ہے۔ ایسی صورت حال میں مسلسل رہنے سے فرد، اپنے اردگرد خود مدافعتی حصار بھی بنا لیتا ہے۔ اس ساری صورت حال میں اگرچہ ردّعمل کے طور پر تشدد پیدا ہوتا ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ جابر جیسا بن کر سارے بدلے لے لے۔ مگر مجبوری جب سماجی معاملہ بن جائے تو مجبوری

کو سہنے کے مشترک احساس کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجبوری کو انسانی حوالوں کے بغیر سہنا ممکن نہیں۔ اس طرح مجبوروں میں مشترک احساس کی بنیاد ناگزیر طور پر انسان دوستی ہی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوامی ادب میں جہاں لومڑی کی عیاری ایک کامیاب رویے کی تجسیم ہے وہاں پیار کو ایک عمومی سماجی رویے کے طور پر پوجا گیا ہے۔ یہ پیار، جنسیت کا ملاپ ہی نہیں، ایک وسیع تر احساس وابستگی ہے جس سے فرد اپنے آپ کو فطرت، انسانوں اور خود اپنے آپ سے وابستہ کرتا ہے۔ ہمارے ہاں تصوّف اور صوفیانہ شاعری دراصل اسی احساس وابستگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ تصوف نے تحکمانہ نظام کے متوازی ایک تحریک کے طور پر کام کیا اور اس کی قبولیت اس بات کی گواہی ہے کہ تحکمانہ نظام کی جبریت کے باوجود مجبوروں میں احساس انسانیت زندہ رہا۔

تحکمانہ نظام اپنے مفاد کے لیے ایک ڈھانچہ بناتا ہے۔ مقصدیت کو حاصل کرنے کے لیے یہ انسانی رشتوں کی مجموعی سماجی صورت حال پر اثر انداز بھی ہوتا ہے بلکہ انھیں تبدیل ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے بڑی کامیابی سے انسانوں کو انسانوں پر جبر کرنے کا وسیلہ بنا دیا۔ انسان بظاہر بڑی سادگی اور وفاداری سے اپنا فرض نبھا رہے ہوتے ہیں مگر دراصل وہ اپنے ہی پیاروں اور اپنی زندگی کو دکھوں سے بھر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر تحکمانہ رشتوں کے دائرے میں میاں بیوی کے رشتے میں انسانی بے ساختگی نہیں آ پائی۔ خاوند اپنی حاکمانہ حیثیت میں رہتے ہوئے، بیوی سے رشتے کی حقیقی شناخت نہیں کر پاتا۔ بیوی تحکمانہ نظام کے تحت اپنے آپ کو وفادار بیوی ثابت کرنے کے سلسلے میں خاوند سے حقیقی رشتے کا احساس نہیں ڈھونڈ پاتی۔ اس طرح دونوں کی زندگیاں بغیر جیے ہی گزر جاتی ہیں۔ وہ دونوں تحکمانہ نظام سے وابستہ فرائض کو نبھا جاتے ہیں مگر ان کی زندگی کا اپنا پن اس کے بیچ ہی کہیں گم ہو جاتا ہے۔ رشتے کی بے ساختگی کی خواہش ایک مجرد سطح پر برقرار تو رہتی ہے مگر میاں بیوی کے درمیان رسمیت کی بندشیں اسے اپنی ذات کے اظہار کا موقع نہیں دیتیں۔ اس کا اظہار بالخصوص اس وقت ہوتا ہے جب میاں بیوی تحکمانہ نظام کے

سونپے فرائض یعنی بچوں کی پیدائش، ان کو سدھانے اور مفید شہری بنانے سے فارغ ہو چکے ہوتے ہیں۔ میاں بیوی میں وابستگی سے متعلق ابلاغ واظہار لفظوں میں نہیں ہوتا کیونکہ تحکمانہ رشتوں میں اس کی مناہی ہوتی ہے، خاوند، چپ چاپ بیوی کے پاس آ بیٹھے گا، وہ آپس میں کچھ بولیں گے نہیں، بیوی چپ چاپ ترکاری بناتی رہے گی۔ ایک قربت کے احساس میں انسانی محبت جلوہ گر ہو جائے گی۔ ماضی کی تلخیوں کو فرائض کی بندش سمجھ کر بھلا دیا جائے گا—— دراصل بوڑھے میاں بیوی

تحکمانہ رشتوں کے اثر سے باہر نکلتے ہی اپنی حقیقی انسانی صورت میں آ جاتے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ جوانی میں اگر تحکم توازن قائم نہ کر پائے تو بیوی میاں جھگڑتے رہتے ہیں۔ ان میں رشتے کے اظہار کا ذریعہ ہی تکرار ہوتا ہے۔ تکرار کسی بھی معمولی معاملے پر ہو سکتی ہے اور اس کا اثر فوری طور پر ختم ہو جاتا ہے۔

بیٹیوں کی مثال لیں۔ گھر والے، باوجودیکہ اپنی بچیوں کو بیاہتے ہیں اور انھیں تحکمانہ شادی کے نظام میں دقتوں کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ وہ بچی کی پرورش اسی نظام کے تحت کرتے ہیں، جسے مجبوری سمجھ کر قبول کر لیا جاتا ہے۔ مگر کنبے میں جس رشتے کا سب سے زیادہ احترام اور تحفظ کیا جاتا ہے وہ بچی سے رشتہ ہے۔ بھائیوں کا بہن سے محبت کا رشتہ اور ماں کا بچی سے اٹوٹ ناطہ۔ باپ کا تحکم صرف بیٹیاں ہی پگھلا سکتی ہیں۔ یہ سب تحکمانہ نظام میں انسانی محبت کی بچی کھچی مثالیں ہیں۔ اسی طرح بچوں سے پیار، پرندوں سے ہمدردی، پودوں درختوں کی سلامتی کی فکر، سب اس بات کی دلیل ہیں کہ تحکمانہ نظام کی تمام تر بربریت کے باوجود مجبور انسانوں میں انسانیت کا احساس برقرار رہا۔

III

زرعی معاشرت و اقتصادیات پر مبنی تحکمانہ نظام ہو یا سرمایہ داری کی افزائش میں مقید صارفانہ مزاج، دونوں کی بنیاد سکھانے (Learning) کے وسیع عمل پر ہے۔ سکھانے کے

طریقے ہمیشہ اپنے مقاصد کے ساتھ بندھے ہوتے ہیں۔ کوئی فرد اپنے گھر، سکول اور وسیع معاشرتی سطح پر مختلف ذریعوں سے یہ مزاج سیکھتا ہے۔ سکھانے کے انھی طریقوں پر تحکمانہ سماجی رشتے بنتے ہیں اور فرد ایک صارف کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ انھی طریقوں کی بدولت اس سے اس کی انسانی فطرت چھین لی جاتی ہے اور اسے کارآمد و مفید شہری بنا دیا جاتا ہے۔ مجبور شہری یا انسان بنانے میں اصل معاملہ سکھانے کے طریقوں پر ہی منحصر ہے۔ اگر طریقے بدل دیے جائیں تو ایک 'نیا آدمی' پیدا ہونے کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس عمل میں انسان نے جو سیکھا، اس کو بدلا جا سکتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کو بدلا جا سکتا ہے، نئے طریقوں کے مسلسل استعمال اور ان پر عمل سے تحکمانہ مزاج کی بنیاد بننے والے شعور کو اَن سیکھا (De-learn) کیا جا سکتا ہے۔ اَن سیکھا کرنے کے ساتھ ساتھ ایک نیا علم، 'نیا آدمی' اور نیا شعور پیدا ہو سکتا ہے۔ نیا شعور بنیادی طور پر انسان کو خود مختار بنائے گا۔ اس خود اختیاری میں وہ انسانوں سے وابستہ رہتے ہوئے، انسانی بہتری کے زیادہ سے زیادہ امکانات پیدا کرے گا۔ واضح رہے کہ انانیت پسندانہ خود اختیاری کا شعور تحکم پیدا کرتا ہے۔ جب ہر فرد خود مختار ہو مگر وہ انسانوں سے وابستگی بھی محسوس کرے تو خود مختاری سیکھنے، کے لامحدود امکانات پیدا کرے گی۔ انسانوں سے وابستگی ان امکانات کو اجتماعی قوت میں بدل دے گی۔ اس طرح سیکھنے سکھانے کا یہ عمل انسان دوست ہی رہے گا۔ ان دونوں طریقوں کا مزاج اور ان کی جزئیات کی صورت یہ ہے:

i- جبری سیکھنے کی بنیاد حافظے پر ہوتی ہے جبکہ خود مختار سیکھنے کا عمل سوال کرنے کی مدد سے جانچ (Verification) اور ناقدانہ مزاج پر مبنی ہوتا ہے۔

اگر سیکھنے والے سے کہا جائے کہ وہ معاملات کو یاد کر لے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اسے اپنے حافظے میں محفوظ رکھ لے۔ جب اسے ان معلومات کو دہرانے یا اگلنے کا کہا جائے تو وہ لفظ بہ لفظ ان کو دہرا دے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ جیسے آپ بینک میں روپے جمع کروا دیں اور حسب ضرورت چیک لکھ کر ان روپوں کو نکلوا لیں۔ (Freire)

اگر سیکھنے کا یہ طریقہ عموی طور پر رائج ہوتو ایک نسل سے دوسری نسل میں معلومات کی ترسیل ہوتی رہے گی۔ چونکہ ان معلومات پر سوال نہیں اٹھایا جا سکتا، اس لیے ان میں اضافے یا ترمیم کی گنجائش ہرگز نہ ہوگی۔ اس طرح تکرار کے باعث یہ علم صدیوں میں بھی نہیں بدلے گا۔ اگر ایک نسل یا کوئی فرد ان معلومات پر سوال اٹھائے تو وہ اپنی سمجھ، اپنے حالات اور خواہشات کے مطابق ان معلومات کو بدل دے گا کیونکہ حالات کبھی ایک جیسے نہیں رہتے یا ان کو دیکھنے کا مطمح نظر بھی ایک جیسا نہیں رہ سکتا۔

ہمارے ہاں ہزاروں برس سے زرعی اقتصادیات پر مبنی تحکمانہ نظام مروج رہا۔ اس نظام نے اپنے ارتقا میں ایک مقام پر آ کر اپنی ضرورت کے مطابق سماجی رشتوں اور اداروں سے افراد کے تعلق کو ایک طے شدہ شکل دے دی۔ لہٰذا اس نے اس نظام میں تبدیلی کی ضرورت کو اہمیت نہ دی۔ یہ نظام مخصوص علم اور ہنروں کو اپنے آپ کو برقرار رکھنے کے لیے کافی سمجھتا تھا۔ مثال کے طور پر سولھویں صدی عیسوی میں جب یورپ میں چھاپہ خانے کی ایجاد ہوئی اور یورپی سیاحوں کی وساطت سے اس کی خبر ایک مغل بادشاہ کو بھی ملی تو اس نے اسے ایک غیر ضروری ایجاد سمجھتے ہوئے ٹھکرا دیا۔ چھاپہ خانے سے عوامی سطح پر علم کی ترسیل ممکن تھی مگر اس نے یہ بات کہہ کر معاملہ ٹھپ کر دیا کہ اس کے دربار میں موجود کاتب، چھاپہ خانے کے مقابلے میں زیادہ اچھا لکھ لیتے ہیں۔

یہی معاملہ پہلی صدی عیسوی میں سلطنت روم میں بھاپ کی قوت کی ایجاد اور استعمال سے متعلق ہوا۔ بھاپ کی توانائی ایک بڑے دیوتا کے حجرے کا دروازہ کھولنے کے لیے استعمال کی گئی۔ کوئی پجاری جب دروازے کے سامنے آتا تو دروازہ زیر زمین بھانپ کی توانائی سے چلنے والے میکانکی نظام سے خود بخود کھل جاتا۔ سوال یہ ہے کہ بھاپ کی توانائی کو وسیع تر ضرورتوں کے لیے اس دور میں کیوں نہ کام میں لایا گیا جیسا کہ بعد ازاں سولہ سترہ صدیوں کے بعد اس کا استعمال شروع ہوا تھا۔ پہلی صدی عیسوی میں سلطنت روم کے پاس غلاموں کی جسمانی قوت میسر تھی اور ان کا اقتصادی و سماجی نظام اسی پر متحرک تھا۔ یہ نہ صرف زندگی کی حرکت معین کرتا تھا بلکہ ذہنی تخلیق

کی حدود اور جواز بھی طے کرتا تھا۔ انسان کسی خیال یا تخلیق کو اس کی ضرورت کے حساب سے پرکھتا اور اپناتا ہے وہ خواہ مخواہ انھیں اپنے آپ پر بے جا بوجھ کے طور پر نہیں اٹھائے پھرتا۔ اس لحاظ سے ہر خیال کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی وقعت ہوتی ہے۔ اسی وقعت کی بنیاد پر اسے قبولیت ملتی ہے یا پھر اسے رد کر دیا جاتا ہے۔

علم کی بنیاد حافظے پر قائم رہنا، دراصل اس جمود اور غیر متحرک نظام معاشرت کی نشاندہی کرتا ہے، جو اپنے آپ میں خود کفیل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں روایات اور ان سے وابستہ معلومات ایک تکرار کے ساتھ آگے بڑھتی گئیں۔ انھوں نے کثرت استعمال سے ضرب الامثال کی صورت اختیار کر لی۔ کسی بھی مسئلے یا رکاوٹ کی صورت میں انھی ضرب الامثال کو دہرا کر آگے بڑھنے کی راہنمائی حاصل کی جاتی تھی۔ اس طرح مسائل اور رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے دیگر امکانات کی گنجائش ختم ہو جاتی اور صدیوں سے مروجہ علم تکرار کے ساتھ زندگی کی رہنمائی کا ایک مسلسل وسیلہ بن جاتا۔

یہ سب معاملہ ان گوشوں میں خصوصی طور پر مؤثر رہا جہاں تبدیلی کی گنجائش کی ضرورت ہی محسوس نہ کی جاتی تھی اور جو تحکمانہ نظام کے تابع تھے۔ اس کے برعکس مزاحمت کی روایت جس کی بنیاد سوال کرنے پر تھی، میں مسلسل جدت اور تنوع نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر حکومت مخالف تحریکات اپنی فکری اور عملی مزاحمت کے اعتبار سے ہر عہد میں مختلف اور متفرق رہیں۔ تحکمانہ نظام کے خلاف فکری سطح پر ہمارے ہاں تصوف کے وسیع دائرے میں چشتیہ، شطاریہ، مہدوی، سکھ مت، ستنامی، ننگے فقیر اور نجانے کتنی تحریکات چلیں۔ سب اپنے اثر کے اعتبار سے مختلف تھیں اور ان کی مزاحمت کا زاویہ باعمل ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف ترجیحات رکھتا تھا۔ ان میں سے کچھ سماجی عملیت سے لوگوں میں تحکمانہ نظام کے خلاف ایک شعور دینے اور نفسی طاقت (Psychic Power) ابھارنے پر زور دیتے تھے تو کچھ براہ راست ٹکراؤ کی راہ پر چلنے کو اہم سمجھتے تھے۔ اسی طرح مزاحمتی ادب میں بھی تنوع نظر آتا ہے جس کا مشاہدہ داستانوں، رومانی قصوں، صوفیانہ

شاعری، واروں، گیت، قصے کہانیوں اور دیگر اصناف میں ہے۔ ان میں انسانی زندگی کے مختلف دکھوں اور ان پر مزاحمتی آرا ملتی ہیں۔

جب آپ اپنی صورت حال، اپنے اردگرد انسانی اور فطری ماحول سے ایک متحرک اور تخلیقی رابطہ و تعلق قائم نہیں کرنا چاہتے تو دراصل آپ اپنے آپ کو بند کر لیتے ہیں۔ اس بندش میں انسان کی فطری تخلیقی قوتیں حقیقی زندگی سے الگ ماورائی دنیائیں (Transcendental Worlds) بسا لیتی ہیں۔ انسان خود اپنے آپ کو ان ماورائی دنیاؤں کی تجرید کو سونپ دیتا ہے۔ زندہ رہنا، اپنی جاری زندگی کا مجموعی مقصد بلکہ زندگی کے بعد کے بارے میں ایک وسیع تر تجرید افراد کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ یہ تجریدی نظام اپنی درجہ بدرجہ تقسیم اور اس سے وابستہ رسومات اپنی ذات میں زندگی کا حقیقی مقصد بن جاتے ہیں اور اصل زندگی کے متبادل کے طور پر فرد کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔

خود مختار بنانے والا سیکھنے کا عمل، صرف اس صورت میں سیکھنے والے کو خود مختار بناتا ہے جب وہ اپنی تفتیش میں آزاد ہو۔ یعنی یہ کہ اسے زیر مطالعہ معلومات پر سوال اٹھانے، انھیں پرکھنے اور پرکھنے کے بعد تبدیل کرنے کی آزادی ہو۔ یہی عمل ناقدانہ مزاج پیدا کرتا ہے۔ اس عمل کا مدعا، بہر نوع تبدیلی سے جڑا ہوتا ہے (Freire)۔ اسی عمل کی بنیاد پر ایجادات ہوئیں بلکہ وہ علم اور ہنر جو زرعی معیشت یا سرمایہ داری کی افزائش کی بنیاد ہیں، اسی عمل کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ زرعی معیشت کا قدیم تحکمانہ نظام انھی علوم و ہنر میں افزائش نہ ہونے کی بنیاد پر ایک سطح پر آ کر رک گیا۔ جدید سرمایہ داری میں ایجادات ہی وہ واحد محرک ہیں جن کی وجہ سے سرمایہ، ٹیکنالوجی اور اشیا کی پیداوار ممکن ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مادی وسائل کی تحقیق پر کثیر دولت خرچ کر کے نئی ایجادات کے امکانات تلاش کیے جاتے ہیں۔ تخلیق کا ہر عمل عمومی طور پر مادی وسائل سے وابستہ اعمال تک محدود رکھا جاتا ہے۔ وہ ناقدانہ شعور جو سماجی رشتوں اور ان میں بہتر تبدیلی کی گنجائش رکھتا ہو، کی بڑی شدت سے مخالفت کی جاتی ہے۔ بلکہ اسے سرمایہ دارانہ مزاج کا دشمن سمجھ کر اس کے خلاف مسلسل

یلغار کی جاتی ہے۔ اس تناظر میں حقیقی ناقدانہ شعور جو انسان کی حقیقی خود مختاری یا آزادی کا باعث بن سکتا ہے، کی قبولیت اور افزائش تاریخی طور پر ممکن نہیں ہو سکی۔ انسان ایک محتاجی کے بعد دوسرے طرز کی محتاجی کا شکار بنتا رہا اور اسے اپنے آپ کو خود مختار بننے کا موقع نہ مل سکا۔

ii- سیکھنے کے جابرانہ عمل میں فرد بندش اور جبر محسوس کرتا ہے جبکہ خود مختار بنانے والے سیکھنے کے عمل میں فرد کو حقیقی خوشی اور لطف محسوس ہوتا ہے۔ (Freire)

جب بھی کوئی انسان سیکھتا ہے تو سیکھنے کے اس عمل میں دراصل ایک انسانی شعور بنتا ہے۔ انسان کسی بھی معاملے کو اپنی ذات اور جس ماحول میں وہ ذات رہ رہی ہو، کے مجموعی تاثر میں پرکھتا ہے۔ یہ میکانکی عمل نہیں کہ آپ بائیسکل کے پیڈل پر بتیاں لگا لیں یا چھوٹی سیٹ کی بجائے بڑی سیٹ لگا لیں۔ اس سے بائیسکل کو کچھ فرق نہیں پڑے گا کیونکہ بائیسکل کا ایک مادی وجود تو ہے مگر یہ زندہ شعور ذات نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس کوئی بھی انسان ایک مادی جسم تو رکھتا ہے مگر اس جسم میں مختلف محرکات کی بدولت مختلف احساسات پیدا ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ صرف یہی نہیں ان احساسات کو آپس میں مجتمع کرنے (Assimilation) اور ان پر ایک شعوری کیفیت بنانے کی بھی اہلیت ہے۔ اس شعوری کیفیت کا انفرادی شخصی ارتقا تو اپنی جگہ پر ہوتا ہی ہے، یہ انفرادی ارتقا ایک اجتماعی تاریخی ارتقا سے پیوست ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے کسی بھی فرد کا شعوری ارتقا اپنی ساخت (Form) اور جوہر (Essence) کے لحاظ سے تاریخی ہوتا ہے۔ یہی نہیں، اس شعور کا کوئی فرد محض قیدی نہیں ہوتا، وہ اپنی انفرادی تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت اس شعور پر سوال اٹھاتا ہے، اور اس میں ترمیم کرتا ہے۔ اس عمل کے نتیجے میں اس کا اس شعور کے ساتھ آزادانہ تعلق پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ تعلق فرد کی اپنی تخلیق ہوتا ہے، اس لیے اس شعور کے ساتھ اس کی وابستگی اور اپنائیت رہتی ہے۔

اگر ایک بچے کو سکھانے کے لیے یہ اصول بنیادی سمجھا جائے کہ بچے کو معلومات حفظ کر لینی چاہییں اور انھیں اپنی زندگی کی بنیاد بنا لینا چاہیے تو دراصل ہم بچے کی فطرت کے برعکس اسے سوال

کرنے، اپنے تجسس کو ظاہر کرنے، پھر اس تجسس کی تسکین کے لیے جواب ڈھونڈنے اور اپنی ذات میں ایک نیا علم ترتیب دینے سے محروم کر رہے ہیں۔ فطرت نے بچے کو ایسی صلاحیتیں عطا کی ہیں جو فطرت اور انسانی اعمال کو سمجھ کر انھیں اپنے فائدے کے لیے تبدیل کرنے کی توفیق دیتی ہیں——اس لحاظ سے انسان دراصل فطرت کے وسیع نظام کا حصہ ہے۔ اس لحاظ سے بچے میں تخلیقی طور پر سیکھنے کی صلاحیت فطری ہی ہے۔ بچہ نہ صرف سوال، تجسس، تحقیق اور اس عمل کے نتیجے میں نتائج نکالنے کی فطری صلاحیتیں رکھتا ہے، وہ ایسے ماحول میں خوش رہتا ہے۔ اس کی قوتیں زیادہ فعال (Active) ہو جاتی ہیں۔ جہاں جسمانی سرگرمیاں ہوں، وہ اپنے ہاتھوں سے کچھ کر رہا ہو یا وہ متحرک طور پر دوسروں کے ساتھ کچھ کر رہا ہو۔ یہ بھی بچے کی فطرت کا حصہ ہے۔

حافظے کی بنیاد پر قائم سیکھنے کا عمل بچے کی تمام تر فطری صلاحیتوں کی نہ صرف نفی کرتا ہے، وہ اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اس غیر فطری عمل کا حصہ بنے۔ اس طرح، چونکہ یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آرہا تھا، اس طریقے کی کامیابی کے لیے خصوصی آداب اور رسوم بنا دی گئیں۔ جس سیکھنے کے عمل کی بنیاد حافظے پر ہو، وہ صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے جب تک یہ ان خصوصی آداب و رسوم کا پابند رہے۔ ان آداب میں بنیادی بات یہ ہے کہ بچہ اپنے آپ کو مجبور سمجھتے ہوئے ان باتوں کا خیال رکھے:

i- سوال کرنا، استاد کی حیثیت کو للکارنے یا چیلنج کرنے کے مترادف ہے کیونکہ بچہ بہر طور استاد کی سکھانے کی خواہش اور مرضی کا محتاج ہے۔ استاد ہی علم اور معلومات کا حتمی سرچشمہ ہے؛ اس لیے استاد کو ہمیشہ خوش رکھنا چاہیے۔ کوئی بات جو بے ادبی یا گستاخی پر محمول ہو سکے، اس سے گریز کرنا چاہیے۔

ii- استاد اپنی تحکمانہ حیثیت میں صرف بچے کو سکھانے کے لیے اس کے ذہن پر ہی اختیار نہیں رکھتا، بچے کا جسم بھی استاد کے قبضہ قدرت میں رہنا ضروری ہے۔ وہ بچے

کے جسم پر کسی بھی مقصد کے لیے تشدد کر سکتا ہے۔

iii- اگر استاد، بچے کو کچھ سکھا رہا ہے تو بچے کو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے کیونکہ علم اس کا حق نہیں بلکہ ایک بخشش یا انعام ہے جو استاد کی طرف سے اسے مل رہا ہے۔

iv- اصل مقصد بچے کو مجبوری میں زندہ رہنے کی تربیت دینا ہے اور اس کے لیے مخصوص معلومات ہی کافی ہیں۔ ان معلومات کو کسی ترمیم کے بغیر زندگی کی بنیاد بنانا مقصود ہے۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے گھر اور سکول کی فضا نہایت مؤثر ذریعہ بنتے ہیں۔ مجبوری میں رہنے کی یہ تربیت دراصل تشدد کو برداشت کرنے، اپنے آپ کو اپنی تمام تر تخلیقی قوتوں کے ساتھ بند رکھنے، جیسے کہا جائے یا جیسے سدھایا جائے، اس کے مطابق سوچنے، کرنے اور آخر کار مخصوص شعور اجاگر کرنے کی تربیت ہے۔ بچے ابتدا میں اس صورت حال پر بگڑتے، احتجاج کرتے اور فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر آخر کار بے بسی میں رہنا سیکھ لیتے ہیں۔ یہی صورت حال بچوں کے سکول سے بھاگنے کی ذمے دار ہے مگر وہ گھر سے بھاگ کر کہاں جائیں ——انھیں مجبور بننا ہی پڑتا ہے۔

اگر بچے کی فطری صلاحیتوں کے مطابق اس کے سیکھنے کے عمل اور ماحول کا بندوبست کیا جائے تو بچہ خود بخود سیکھتا چلا جاتا ہے۔ سیکھنا، اس کی فطرت میں شامل ہے۔ اگر آپ کا بچے کو سدھانا مقصد نہیں تو بچہ جو بھی سیکھے گا وہ ٹھیک ہی ہوگا۔ اس عمل کے ہر مرحلے پر، بچہ اپنے اردگرد مادی دنیا، انسانی اعمال اور ان سے بننے والے اداروں کو تہہ در تہہ جانتا رہے گا۔ اگر وہ سیکھنے کے دوران کوئی سوال کر سکتا ہے تو وہ اس سوال کے جواب پانے کے وسیلے میں بھی آزاد رہے گا۔ وسیلہ کوئی بھی ہو، حقیقت اور سچ اپنی جگہ پر اٹل ہوتا ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ بچہ اس سچ تک پہنچے۔ وہ اس کا راستہ خود منتخب کرے۔ جب وہ اس مقصد تک پہنچ جائے گا تو اسے اپنے آپ پر کس قدر اعتماد

ہوگا۔اسے کس قدر لطف آئے گا۔

اگر آپ کا مقصد یہ ہے کہ بچہ خودمختاری سے سیکھے تو آپ کا کردار سکھانے والے کے طور پر یہ ہوگا:

i- آپ بچے کے ذہن میں پیدا شدہ سوالات کے جوابات حاصل کرنے کے لیے بچے کو ممکنہ امکانات اور وسائل کی دستیابی میں مدد دیں گے۔اس کے ساتھ بحث ومباحثہ کریں گے ---- اصل معاملہ یہ ہے کہ سیکھنے کے عمل میں بچہ نہ صرف خودمختار رہے گا بلکہ سیکھنے کے آخری نتائج کا فیصلہ بھی کرے گا۔اس طرح اس عمل میں اصل مقصد بچے کو سیکھنے میں آزاد اور خودمختار (Autonomous Learner) بنانا ہوتا ہے۔

ii- سیکھنے کے عمل میں استعانت کرنے والا استاد، ماں یا باپ ایسا ماحول بنانے کی کوشش کریں گے، جس میں بچہ ہر لحظہ تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ان تخلیقی سرگرمیوں کا انتخاب (Selection of Activities) اور تنفیذ (Implementation) اس طرح کی جائے گی کہ بچہ سیکھنے کے دوران اپنی خودمختاری سے متعلق ہنر (Skills) اور رویے (Attitude) بھی سیکھے۔وہ دوسروں کے ساتھ اشتراک اور مکالمے کی اہمیت جانے۔وہ انسانوں سے وابستگی کے لطف اور تجربے کی گرمائش کو محسوس کر سکے۔وہ اردگرد کی دنیا سے ایک تعلق محسوس کرے۔

iii- مجبوری پیدا کرنے والا سکھانے کا عمل معلومات کو جامد حقیقتیں (Static Facts) سمجھتا ہے (Freire)۔وہ ان کی تشریح کی تو اجازت دیتا ہے مگر ان کی بنیادی ساخت کو تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔اس کے برعکس خودمختار بنانے والا عمل بچے یا انسان میں موجود فطری صلاحیتوں کو ان کی امکانی حدود سے بھی پرے لے جانے کی پرورش کرتا ہے۔ان صلاحیتوں کے استعمال سے کسی بھی صورت حال، کیفیت،

اصول، نظام، شعور اور خود فطرت اور انسان کو بدلا جاسکتا ہے۔اس کا بنیادی محرک تبدیلی ہے۔اس لحاظ سے خودمختار بنانے والا عمل اپنی ذات میں محض ایک عمل ہوتا ہے مگر اس کی اثر پذیری مختلف سمتوں میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔انسانی شعور ہر سطح پر متحرک رہتا ہے۔اس سے تبدیلی کے لامحدود امکانات پیدا ہوتے ہیں۔

iv- سیکھنے کا جامد طریقہ حقیقی صورت حال کا سامنا کرنے کی ہمت پیدا نہیں کرتا۔اس میں سچائی، جزوی یا تجریدی مفروضوں کی صورت میں رہتی ہے (Freire)۔ اس کے برعکس خودمختار بنانے والا عمل سچائی کو اس کی کلیت (Totality) میں جانچے بغیر رہ نہیں سکتا۔بلکہ یہ حیاتیاتی نمو (Organic Growth) کی طرح ہر لحظہ ہر مقام پر ایسے گوشے پیدا کرتا رہتا ہے جہاں پر آزادانہ ارتقا اور نمو کی گنجائش ہوتی ہے۔اس طرح کسی بھی حقیقت کو سیکڑوں پہلوؤں سے دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔

v- سیکھنے کے جامد ماحول میں فطری طور پر سیکھنا اور اس سے متعلقہ عمل روپذیر نہیں ہوتا۔اس میں زیادہ تر زور 'یقین کرنے اور قبول کر لینے' پر ہوتا ہے۔اس لحاظ سے معلومات کو 'مقدس' حقیقتوں کی صورت میں قبول کرنا لازم ہوتا ہے۔اس کے برعکس خودمختاری کا طریقہ تحقیق پر مبنی رہتا ہے اور اس میں ہر اصول، معلومات، نتیجہ اور کیفیت وغیرہ کسی بھی وقت دلیل اور ثبوت کی صورت میں بدلی جاسکتی ہے۔اس لحاظ سے اس عمل میں کوئی بات 'مقدس' نہیں ہوتی۔

vi- تحکمانہ نظام میں سیکھنے والا سوال یا مکالمہ نہیں کرسکتا۔سوال کرنے کو بے ادبی اور گستاخی سمجھا جاتا ہے۔جب سوال ہی کرنے کی اجازت نہ ہو تو مکالمے کی گنجائش سرے سے ختم ہوجاتی ہے۔تحکمانہ نظام چونکہ لوگوں کو سدھاتا ہے، اس لیے سدھانے میں معلومات کو بعینہٖ قبول کروانا مقصود ہوتا ہے۔

IV

خودمختاری پیدا کرنے والے سکھانے کے طریقے کی بنیاد ہی سوال پر ہوتی ہے۔ چونکہ اس کا مقصد سدھانے کی بجائے سکھانا ہوتا ہے، اس لیے سیکھنے والے کے ذہن میں پیدا ہونے والے تجسس اور اس سے اٹھنے والے سوالات کو ہی سیکھنے کے عمل کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ اگر مل جُل کر سیکھنے کو بنیاد بنالیا جائے تو تمام سیکھنے والوں کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات امکانات کی ایک وسیع بنیاد فراہم کریں گے۔ اس وسیع بنیاد پر انفرادی تحقیق، مکالمے کی صورت میں افراد کو ایک دوسرے سے وابستہ کردے گی۔ اس طرح مکالمے کی مدد سے، مکالمے میں شریک لوگ اپنی اپنی دانست میں معاملہ فہمی اور مسئلے کے حل میں اپنا اپنا حصہ ڈالیں گے۔ اس عمل میں خودسری اور گھمنڈ کی بجائے اشتراک وتعاون، برداشت اور ایک دوسرے سے سماجی وابستگی کا احساس پیدا ہوگا۔

محتاجی اور مجبوری کی صورت حال میں بھی مکالمہ ہوتا ہے مگر یہ مکالمہ محدود دائرے میں مقید رہتا ہے۔ مثال کے طور پر مجبوری کی صورت حال میں مکالمے کی صورت یہ ہوگی:

بیٹی: امی، وہ مجھے مارتا ہے، مجھے مجبور کرتا ہے کہ سونے سے پہلے میں، اس کی ماں اور اس سے معافی مانگوں کہ اگر مجھ سے بھول چوک میں بھی کوئی غلطی ہوگئی ہو، تو وہ مجھے معاف کردیں۔

ماں: اصل میں تمھاری ساس، زبیر کو مجبور کرتی ہوگی۔ وہ بھی تو خود کماتا نہیں، اگر کماتا ہوتا تو آزادی سے رہ سکتا تھا۔

بیٹی: اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں سارادن گھربار سنبھالتی ہوں، وہ سارادن مجھے تفتیشی نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں کہ مجھ سے کوئی کوتاہی ہو اور وہ مجھ پر

پھٹکاروں کی یلغار شروع کردیں۔ آخر میں نے کیا کیا ہے جو مجھے ایک قیدی اور مشقتی سمجھا جاتا ہے۔

ماں: مَیں نے اس لیے تمھاری شادی، تمھارے چچا کے ہاں کردی تھی کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ تمھارے باپ کے مرنے کے بعد میں نے اپنے سسرالیوں سے ناطہ نہ رکھا۔ تمھارا چچا تو اچھا آدمی تھا، اس کا مجھے بھروسہ تھا، مگر وہ رہا نہیں۔۔۔ اب کیا کروں؟

بیٹی: زبیر کو ہمیشہ خوف رہتا ہے کہ میں اسے چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ وہ مجھ سے شکل وصورت میں میل نہیں کھاتا اور پھر وہ نکھٹو ہے۔ وہ سارادن جب بھی موقع ملے، یہ بات لے بیٹھتا ہے اور سخت تلخی سے کلام شروع کردیتا ہے۔ اگر شادی کے پانچ چھے ماہ بعد بچہ نہیں ہوا تو اس میں ایسی کیا خرابی ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میں جان بوجھ کر اس کا بچہ پیدا ہی نہیں کرنا چاہتی کیونکہ بچہ اس پر چلا گیا تو خوش شکل نہ ہوگا۔

ماں: ایسے بھی کبھی ہوا ہے؟ کیسا احمق ہے! مگر میری سنو، شادی دراصل پودے کو نرسری سے نکال کر زمین میں لگانے والا معاملہ ہے۔ جب پودا گملے سے نکال کر زمین میں لگایا جاتا ہے تو ایک دفعہ اپنے پتے گرادیتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ نئی مٹی سے مانوس ہوتا ہے اور نئی کونپلیں نکال لیتا ہے۔ شادی میں دقتیں تو آتی ہیں — عورت کا سب سے بڑا امتحان ان کو کامیابی سے نبھانا ہے۔ ہر عورت کو دکھ اٹھانا پڑتے ہیں۔ یہ تمھیں بھی کرنا ہوگا۔

بیٹی: اگر میرا گلا گھونٹنا ہی ہے تو آپ مجھے یہیں زہر لادیں، میں اپنے سسرال والوں کے گھر نہیں جاؤں گی۔

ماں: بیٹی، عورت کی یہی قسمت ہے، کچھ بھی سوچو، کچھ بھی کرلو، تمھیں اس کو نبھانا ہی ہوگا۔

یہاں ماں بیٹی کے درمیان مکالمہ تو ہو رہا ہے مگر مسئلے کا حل نہیں مل رہا جو اس بچی کی صورت حال میں بہتری لا سکے۔ ماں بدستور تحکمانہ نظام میں عورت کی بے بسی کو برقرار رکھنے اور اسے قبول کرنے پر مصر ہے۔ وہ جن 'قوانین' کو بچی کی زندگی کی بنیاد بنانا چاہتی ہے، ان کو پھلانگنا اس کے نزدیک ممکن نہیں۔ اس طرح کی گفتگو ہزاروں سالوں سے ماں اور بیٹیوں کے درمیان ہوتی رہی ہے مگر وہ کسی ایسے عملی حل کی طرف نہ جا سکیں جس سے ان کی زندگیاں واقعتاً بدل جائیں۔ اگر مکالمے میں عملیت (Praxis) کی صورت یا امکان میسر نہ ہو تو وہ صرف زبانی جمع خرچ (Verbalism) ہی رہ جاتا ہے۔ یہ سب تحکمانہ نظام کی پکڑ اور گرفت کی علامت ہے۔ اس کے زیر اثر زیادہ تر مکالمے زبانی جمع خرچ کے سوا کچھ نہیں ہوتے ان میں بنیادی محرک تبدیلی نہیں ہوتا۔

اگر سوال کرنے کو لامحدود سطح پر مکالمے کی بنیاد بنا لیا جائے تو پھر تمام تر حدود اور فکری بندشیں ٹوٹ سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے ایک بچے سے متعلق تصورات یہ ہیں کہ وہ ایک بے بس اکائی ہے، اس کا ذہن ایک خالی صفحے کی طرح ہے جس پر آپ جیسے چاہیں نقش ثبت کر سکتے ہیں۔ یہ تصور تحکمانہ نظام کے لیے بہت کارگر ہے، کیونکہ انھی تصورات کی بنیاد پر اسے کامیابی سے سدھانا ممکن ہوگا۔ یعنی یہ کہ بچہ دراصل ایک فرمانبردار فرد میں ڈھلنے کی صلاحیتیں رکھتا ہے اور اسے تشدد اور غیر متحرک معلومات دے کر سدھانا ممکن ہے۔ اگر اس معاملے پر تحکمانہ مقاصد سے قطع نظر، آزادانہ طور پر مکالمہ کیا جائے تو صورت یہ ہوگی:

استاد: بچوں کو آج کل پڑھانا بہت مشکل ہو گیا ہے، مار کے بغیر تو یہ پڑھتے ہی نہیں۔ مگر ماں باپ ایسے ہیں کہ بچوں کو ایسے ہاتھ لگا دیں تو طوفان کھڑا کر دیتے ہیں۔

عام شہری: آپ کی بات تو ٹھیک ہے مگر انھیں صرف اس وقت مارنا چاہیے جب سارے طریقے ختم ہو جائیں۔

استاد: استاد کا کام تو سمجھانا ہے، بچے اگر توجہ ہی نہ دیں تو کیا کریں؟

دوسرا استاد: بچے اگر توجہ نہیں دے رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ استاد جو کچھ بھی پڑھا رہا ہے، وہ بچوں کے لیے ایسا دلچسپ نہیں۔ اگر بچے گھنٹوں کارٹون دیکھتے نہیں تھکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کارٹون ان کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ انھیں زبردستی تو نہیں بٹھایا جاتا۔۔۔۔ اگر سبق دلچسپ ہو جائے تو بچہ خود بخود اس کے ساتھ چپک جائے گا ــــ مارنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔

پہلا استاد: اگر ہمیں مارنے کا حق نہیں تو ہمیں کیا مصیبت پڑی ہے کہ ہم پڑھائیں؟ جہنم میں جائیں بچے اور۔۔۔۔

دوسرا استاد: یہ غصہ کرنے والی بات نہیں ــــ آپ خود اپنا بچپن یاد کریں ــــ جو استاد ہمیں مارتے تھے یا دباؤ میں رکھتے تھے، ہمیں بالکل اچھے نہ لگتے تھے۔ اُس وقت ہم سوچتے تھے کہ یہ استاد ہمیں پیار سے کیوں نہیں پڑھاتے؟ جو استاد ہمیں پیار سے پڑھاتے اور ہمارے ساتھ ان کا رویہ دوستانہ ہوتا تھا، وہ ہمیں بہت اچھے لگتے تھے۔ بچے ہمیں اٹھ کر ماریں گے تو نہیں مگر ہم ان سے نفرت کرنے کا حق تو نہیں چھین سکتے۔

عام شہری: آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے میں نے اپنے بیٹے کو جب پہلی دفعہ ڈانٹا تھا تو اس نے مجھے عجیب ترشی اور نفرت بھری نظر سے دیکھا تھا۔ اس وقت اس کی نظر میں بغاوت کا شرارہ تھا ــــ سچی بات ہے کہ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ میں نے سوچا، ہم بچوں سے اس قدر پیار کرتے ہیں۔ اگر وہ دل سے ہمیں پیار ہی نہ کریں اور ہماری ڈانٹ کا اثر لے کر دل ہی دل میں ہمیں ناپسند کرنے لگیں تو یہ سخت بے اعتباری والے

رشتے کا معاملہ ہوگیا—— لہٰذا میں تو اب ہر معاملے پر بچے سے بات کرتا ہوں، اسے دلائل دے کر سمجھاتا ہوں—— اب وہ میرا بیٹا کم اور دوست زیادہ ہے۔

پہلا استاد: بات تو ٹھیک ہے، مگر ہماری جیسے تربیت ہوئی ہے، ہم اسی طرح ہی آگے تربیت کریں گے۔ ہم خود اس کو کیسے بدل سکتے ہیں؟

عام شہری: آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، مجھے بعض اوقات بے بسی سی محسوس ہوتی ہے کہ میں کس طرح اچھے طریقے سے بچوں کی پرورش کروں—— یہی سوچتا رہتا ہوں کہ کم از کم میرے بچے مجھ سے تو اچھے ہوں۔۔۔

دوسرا استاد: میرا خیال ہے، ہمیں مل بیٹھ کر گفتگو کرنی چاہیے اور تربیت میں تبدیلی لانے والے رویّوں اور عوامل پر غور کرنا چاہیے۔

اس مختصر سے مکالمے میں حصہ لینے والا ہر فرد مکالمے سے پہلے اپنے اپنے خیالات کے حوالے سے بچوں کی تربیت کے بارے میں مخصوص نقطۂ نظر رکھتا تھا۔ مکالمے کے بعد، ایک دوسرے کے خیالات باہم مل جانے سے ایک نئی صورت حال اور امکان کی گنجائش پیدا ہوئی۔ اس امکان کا تعلق تربیت کے نئے اسلوب اور ڈھنگ تلاش کرنے سے ہے۔ چونکہ اس مکالمے میں لامحدود امکانات کی تلاش پر سب کا اتفاق ہے، اس لیے مکالمے میں توسیع کی بھی گنجائش موجود ہے۔ چونکہ اس مکالمے کا ہدف حقیقی صورت حال کو تبدیل کرنا ہے، اس لیے ہر بات اپنے طور پر عملیت کا پہلو رکھتی ہے۔ یعنی یہ کہ بات چیت، عملیت کے ساتھ مل جائے تو حقیقی تبدیلی کے امکان پیدا ہوں گے۔

تبدیلی کا تعلق، انسانوں یا انسانوں سے متعلق اداروں سے ہی ہوسکتا ہے۔ اور یہ بھی کہ تبدیلی کے عمل کو اگر لوگ قبول کرلیں تو تبدیلی کا عمل برقرار رہے گا۔ اگر قبولیت ہی نہ ہو تو تبدیلی سے متعلق مکالمہ آگے ہی نہ بڑھے گا۔ حقیقی تبدیلی تو دور کی بات ہے۔ مکالمے میں جب سب

لوگوں کو شریک کیا جائے گا تو وہ اپنی دانست میں اپنے اپنے تجربات کو مکالمے میں شامل کرنے کے اہل ہوں گے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ تجربات اور ان پر پیش کی جانے والی رائے درست ہو—— ان پر دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر بات چیت کرنے سے ایک تیسری رائے پیدا ہوگی۔ مکالمے کے بعد ان میں سے غیر ضروری یا کم اہم باتیں حذف ہو جائیں گی۔ یہ ترمیم اور تحریف سب لوگ مل کر گفتگو کے ذریعے کریں گے۔ تیسری رائے دراصل ایک بہتر صورت ہوگی اور اس میں مختلف آرا اور تجربات شامل ہوں گے۔ تجربات کا تعلق ٹھوس حقائق سے ہے اور ان پر رائے دراصل افراد کے ان ٹھوس حقائق کو دیکھنے کا مخصوص نقطۂ نظر ہے۔ اس طرح ذاتی آرا تیسری رائے کی صورت میں ذاتیات کی حدود سے نکل کر ایک غیر ذاتی یا معروضی (Objectivity) صورت اختیار کر لے گی۔ غیر ذاتی یا معروضی صورت کی جڑیں ذاتی مشاہدات اور آرا میں تو ہیں مگر اب وہ ایک اجتماعی قبولیت کے درجے پر آ کر غیر ذاتی صورت اختیار کر لے گی۔ اس میں شخصی مشاہدات اور آرا بدستور ایک مختلف صورت میں جلوہ گر ہو جائیں گی۔ یہ ارتقا محض فکری ہی نہیں، اس ارتقا میں چونکہ افراد مکالمے کی وساطت سے بدستور شامل ہیں، اس لیے وہ غیر ذاتی اور معروضی سطح پر بھی اسے قبول کریں گے۔ یعنی یہ کہ مکالمہ دراصل کسی بھی رائے کے ارتقا میں ایک سماجی سرگرمی کا محتاج رہتا ہے۔ اس عمل میں کوئی بھی فرد، ایک فرد ہونے کے ناطے، اپنی زندگی کے تجربات اور ان پر اپنی رائے کو ایک سچائی اور ٹھوس حقیقت سمجھ کر شامل ہو جاتا ہے۔ اس طرح افراد کے ناطے لوگوں میں رچا بسا شعور اس عمل میں آملتا ہے۔ دوسری طرف چونکہ ہر فرد کی انفرادی سچائی کو مکالمے کے اس عمل میں ایک سچائی کے طور پر قبولیت ملتی ہے، ہر فرد ایک ناقابل تنسیخ اکائی کے طور پر شناخت پالیتا ہے۔ یہی شناخت دراصل اس کی سماجی قبولیت ہوتی ہے۔ تیسری رائے تک پہنچتے پہنچتے انفرادی سچائی اپنا واضح نشان اور شناخت دوسروں کے ساتھ مل کر گم کر لیتی ہے۔ مگر اس عمل میں فرد کی ایک ناقابلِ تنسیخ اکائی کے طور پر قبولیت اس کے انفرادی شعور کو انفرادی حدود سے نکال کر اجتماعی حسیات اور کلیت میں شامل کر دیتی ہے۔ اس طرح

مکالمے کی مدد سے نہ صرف انفرادی تجربات اور رائے غیر شخصی سچائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے بلکہ فرد بھی اپنی انفرادیت کے شعور کو ایک وسیع معانی عطا کرتا ہوا، اجتماعیت کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہی وہ عمل ہے جس سے تحکمانہ خودسری اور انانیت کی نفی ہوتی ہے۔ چونکہ مکالمے کا عمل انسانوں کی حقیقی صورت حال سے وابستہ رہتا ہے، اس لیے یہ ٹھوس حالات میں تبدیلی لانے کا باعث بنتا ہے۔

مکالمہ صرف اسی صورت میں آگے بڑھے گا جب سوال کرنے کی بنیاد اور رخ حقیقی صورت حال کی طرف ہو۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عہدہ یا اعلیٰ ڈگری رکھنے والا ہی اپنے علم اور تجربے کی بنیاد پر عقل کل نہیں ہوسکتا اور نہ ہی وہ ہر انسانی صورت حال پر محاکمہ (Judgement) دے سکتا ہے۔ عام طور پر مختلف شعبوں میں جہاں رسمی طور پر ڈگری یافتہ لوگ کام نہیں کرتے، ان کی رائے لینے کو وقت کا ضیاع سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ایسی صورت حال میں مثال کے طور پر کسان یا صنعتی مزدور اپنے کام کے لحاظ سے کارآمد ہنر اور تجربہ رکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ اپنے تجربات کو بہت بلاغت کے ساتھ بیان نہ کر پائیں۔ ان کے پاس بہت بڑا ذخیرہ الفاظ نہ ہو مگر یہ بات طے ہے کہ ان کے تجربات اور ان پر ان کی رائے کا کوئی بھی دوسرا متبادل نہیں بن سکتا۔

مکالمہ، دراصل ابلاغ ہے، جو دو یا دو سے زیادہ اکائیوں کے درمیان روپذیر ہوتا ہے۔ تحکمانہ نظام میں ابلاغ یک طرفہ رہتا ہے اور مجبوروں کی رائے کو قابلِ غور نہیں سمجھا جاتا۔ لہٰذا تحکمانہ مزاج میں ایسا کرنا ممکن بھی نہیں کیونکہ یہ نظام لوگوں کو 'کھاتا' ہے، انھیں استعمال کرتا ہے۔ اس میں مجبوری اور استبداد (Coercion) ہی بنیادی طریقہ کار ہوتا ہے۔ اب یہ تو نہیں ہوسکتا کہ غلام سے آقا پوچھے کہ کیا وہ غلام ہونا پسند کرے گا؟ ظاہر ہے کہ غلام تو کوئی بھی نہیں بننا چاہے گا۔ اسے تو صرف مجبور بنا کر، خوفزدہ کر کے یا سزائیں دے کر ہی غلام بنایا جاسکتا ہے۔ اس تناظر میں تحکمانہ نظام میں یک طرفہ ابلاغ کی حیثیت حکم چلانے کے علاوہ کچھ نہیں رہتی۔ ایک نظام میں احکامات کو سمو دیا جاتا ہے۔ ان احکامات کی فرمانبرداری کا مطلب ہے کہ بات کو مان

لیا گیا۔ اگر نہیں، تو پھر سزاؤں اور عقوبتوں کے لیے تیار رہے۔

پروپیگنڈا، اشتہارات اور فلمیں بھی ابلاغ کی ایک صورت ہیں۔ مگر یہ یک طرفہ ہوتی ہیں۔ ان کو دیکھنے والا، ان کو مجہول طور پر (Passively) وصول کرتا ہے۔ اگر ان میں فرد کی حقیقی صورت حال کی کسی نہ کسی صورت میں نمائندگی ہو تو اس کردار یا صورت حال کی وساطت سے دیکھنے والا اس یکطرفہ ابلاغ کو دوطرفہ بنا دیتا ہے۔ وہ کرداری نسبت (Relating with characters) اور اس سے وابستگی پیدا کر کے اپنے آپ کو مکالمے کا دوسرا کردار بنا لیتا ہے۔ اس طرح رائے کی تشکیل کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔

وسیع معنوں میں عوامی رائے کی بنیاد مکالمے پر ہی ہوتی ہے۔ اس مکالمے کا مقصد تبدیلی ہو تو عوام کے پسندیدہ اور قبولیت والے ادارے پیدا ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر اگر لوگ اپنے علاقے کے نمائندہ فرد کی شخصی خصوصیات پر حقیقی مکالمہ کریں تو ایک بہتر سیاسی انتخاب ممکن ہے اور اسے عوام کی قبولیت بھی حاصل ہوگی۔ ایسے نمائندوں پر مشتمل حکومت پر لوگوں کو اعتبار بھی ہوگا۔ اگر اعتبار اور قبولیت کی تجرید صرف ووٹ دینے کو مان لیا جائے اور عوام کو معلوم ہو کہ ان کا 'نمائندہ' دراصل ان کا نمائندہ ہے ہی نہیں تو ایک اجتماعی بداعتمادی پیدا ہوگی۔ حکومت جو کچھ کہے گی، اس پر اعتبار نہ ہوگا۔ اس طرح نمائندگی اور حکومت سازی لوگوں کے لیے بے معنی سا عمل رہ جائے گی۔

مکالمے کی ایک اور خصوصیت عاجزی (Modesty) ہے (Freire)۔ عاجزی کا مطلب نہ تو کمزور ہونا اور نہ ہی بے بس ہونا ہے۔ اس کا انسان دوستی کے سیاق میں مطلب اپنے آپ کو انسانوں سے وابستہ رکھتے ہوئے، اپنے آپ کو ایک عام شخص (An Ordinary Man) محسوس کرنا ہے۔ یہ ایک وسیع تر شعور ہے جو تحکمانہ مزاج میں پلنے والے انانیت پسندانہ شعور کی نفی کرتا ہے۔ اپنے آپ کو ایک عام شخص تسلیم کر لینے سے انسانوں کی اجتماعیت، ایک فرد میں سمٹ جاتی ہے۔ فرد کی انفرادیت تو برقرار رہتی ہے مگر اس میں گھمنڈ کی بجائے وابستگی کا عنصر غالب

ہوتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ باغ میں اُگے طرح طرح کے پھولوں میں ایک پھول کی انفرادی شناخت تو ہو مگر وہ باغ کی اجتماعی رنگارنگی میں اپنی انفرادی شناخت کو سمو دے۔ یعنی یہ کہ باغ کا حُسن، اس کے شامل ہونے سے بنا ہے مگر اس کلیت میں وہ ایک عام پھول کی طرح ہے، جیسے دیگر پھول ہیں۔ اگر 'عام آدمی' کے شعور کو سماجی رویوں میں سمجھنے کی کوشش کریں تو، عام آدمی کی اپنے بارے میں یہ سوچ ہوگی:

-1 ''میں ہر وقت سیکھنے اور تبدیل ہونے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے اپنی علمیت اور رائے پر کوئی گھمنڈ نہیں۔''

-2 ''میں اپنی ذاتی شناخت اور عمل میں دوسروں سے نسبت اور وابستگی کے بغیر کچھ نہیں—— میں دوسروں سے سیکھتا ہوں اور وہی میرا پہلا اور آخری حوالہ ہیں۔''

-3 ''میری آرزو ہے کہ میں جب دنیا سے جاؤں تو اپنے لوگوں کے لیے ایک بہتر زندگی یا بہتر زندگی کے امکان چھوڑ کر جاؤں۔ میرے لیے خوشی کی بات یہ نہیں کہ میں نے خود کتنی کامیاب زندگی (Successful Life) گزاری بلکہ یہ ہے کہ میں کتنی اچھی دنیا (Better World) یا اس کے امکانات چھوڑ کر جا رہا ہوں۔۔۔''

-4 'میرے لیے ملکیت یا احساس ملکیت کی بجائے وابستگی اور احساسِ وابستگی اہم محرکِ زندگی ہے۔ میری خوشی یہی ہے کہ میں تخلیقی سطح پر انسانوں سے وابستہ رہوں۔

-5 'میرے انسان رہنے کے لیے مجھے انسانوں سے وابستگی درکار ہے۔'

-6 'میں انسانوں کے لیے جو کچھ بھی کر رہا ہوں، یہ سخاوت نہیں، میرے انسان ہونے کا ثبوت ہے۔ میں نسلِ انسانی سے ہوں اور اس ثبوت کے طور پر میرے لیے انسانوں سے وابستہ رہنا لازم ہے۔'

'عام آدمی' سے منسلک شعور انسان دوست رویوں کو سنوارنے کی وسیع تر قوت رکھتا ہے۔ یہ رویے متشدّد داخلاقی ضابطوں کا متبادل بن کر انسان کو خود مختاری اور صحیح معنوں میں آزادی مہیا کر سکتے ہیں۔

مجبوری کو تسلیم کرتے ہی، بے بسی اور حالات سے لاتعلقی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی لاتعلقی میں بات نہیں ہو پاتی۔ اگر مکالمہ ہو بھی تو اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ لاتعلقی، عملیت کو ختم کر دیتی ہے۔

حقیقی مکالمہ لاتعلقی اور سکوت کو توڑنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ جیسے جیسے یہ اپنے ارتقا میں آگے بڑھتا جائے گا، اس میں تبدیلی کے امکانات واضح ہوتے جائیں گے۔ تبدیلی کے امکانات ہوں گے تو امید (Hope) بھی پیدا ہوگی۔ جب بے بسی کی صورت حال ہوگی تو لاتعلقی پیدا ہوگی۔ لاتعلقی میں انسان جیسے تیسے جینا سیکھ لیتا ہے۔ وہ اسے بدلنے کی خواہش نہیں رکھتا۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کی صورتحال ایک گنبدِ بے در یا بند گلی جیسی ہے (Limit-Situation)، اس میں سے باہر نکلنا ممکن ہی نہیں (Freire)۔ اس صورت حال میں ناامیدی پیدا ہوتی ہے۔ ناامیدی دراصل بے بسی کی گرفت کا ہی اظہار ہے۔

امید اور ناامیدی کے درمیان فرق صرف امکانات کی دستیابی ہے۔ جب کسی بھی صورت حال کو تبدیل کرنے کے لیے امکانات کی گنجائش نہ رہے تو ناامیدی پیدا ہوتی ہے۔ ناامیدی کا احساس، تحکمانہ نظام کے اندر ایک خود مدافعتی ہتھکنڈے کے طور پر موجود رہتا ہے۔ یہ نظام مجبوری پیدا کرتا ہے۔ مجبوری میں بے بسی آنا لازم ہے۔ بے بسی (Helplessness) اور جزوی پذیرائی (Partial Re-inforcement) کے درمیان امید اور ناامیدی پنڈولم کی طرح ایک مساوی فاصلے کے درمیان اپنی جگہ بدلتی رہتی ہے۔ مگر یہ بات طے ہے کہ اس صورت حال میں کوئی بھی فرد عملیت سے دُور ایک بیگانگی کی فضا میں ہی جیتا ہے۔ مجبوری کا نظام افراد کو آزادانہ طور پر امکانات تلاش کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ مجبور کو مخصوص ڈھانچے میں ہی زندہ رہنا ہوتا ہے۔

امکانات کا نہ ہونا ہی فرد کو مجبور بناتا ہے۔ اس صورت حال میں اپنے آپ کو کوسنے اور تجریدی یا خیالی تسلیوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اکثر یہ جملے دہرائے جاتے ہیں:

'ہم کچھ نہیں کر سکتے، ہم زوال پذیر معاشرہ ہیں۔'

'صبر کرنا ہی بڑی نیکی ہے، اس کا اجر ضرور ملتا ہے۔' وغیرہ وغیرہ

لوگوں کے عمومی رویوں میں اداسی، بے چارگی، دکھ سے لگاؤ (Melancholy)، جذباتیت (Sentimentality)، اور اس سے ملتے جلتے احساسات موجود ہوتے ہیں۔ چونکہ لوگوں کی جذباتی صورت حال میں یہ معاملات بہت صدیوں سے چلے آ رہے ہیں، اس لیے لوگوں کی پسندیدہ موسیقی میں دروں بینی (Introversion)، اداسی اور تنہائی کا عنصر زیادہ ہے۔ شاعری میں محبوب سے بچھڑنے کا صدمہ اور برہا کا درد بسا ہوا ہے۔ معنوی اعتبار سے دیکھیں تو اداسی کا یہ مزاج دراصل زندگی میں اپنے آپ سے بچھڑ جانے کے بعد لازماً پیدا ہوتا ہے۔ اپنے آپ سے بچھڑ جانا، دراصل عاشق کا اپنے محبوب سے جُدا ہو جانا ہے۔ یہی صورت حال کرداری صورت میں لوک ادب کی مختلف اصناف اور عمومی شاعری میں نظر آتی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ تحکمانہ نظام میں جب کوئی فرد مجبور بنا دیا جاتا ہے تو امکانات کی عدم دستیابی ہی، اس مجبوری کو برقرار رکھنے میں بنیادی محرک بنتی ہے۔ مکالمہ اگر تبدیلی کی خواہش پر کیا جائے، اس میں تمام تر حوالہ جات حقیقی زندگی سے متعلق ہوں اور اس عمل میں انسانوں سے وابستگی رہے تو لامحالہ تبدیلی کے امکانات ضرور پیدا ہوتے ہیں۔ امکانات ہوں گے تو عملیت (Praxis) کی گنجائش رہے گی۔ جب تک عملیت کی کوشش جاری رہے گی، امکانات پیدا ہوتے رہیں گے۔ ایسے میں ناامیدی کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔ جہاں مکالمہ ہو گا وہاں ناامیدی نہیں رہ سکتی۔

مکالمے کا بنیادی محرک تبدیلی لانا ہے۔ فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے انسان ہونے کا جوہر تبدیلی سے ہی منسلک ہے۔ کوئی بھی فرد آگے بڑھتے وقت میں ایک خاص مقام پر پیدا

ہوتا ہے اور اسے ایک خاص مقام پر اس وقت کے دھارے سے خارج ہو کر دوسرے انسانوں کے لیے خالی جگہ بنانا ہوتی ہے۔ اس اٹل معاملے کے حساب سے ہر فرد اپنی زندگی تاریخ کے ایک خاص دور میں گزارتا ہے اور اس طرح اس کا زندہ رہنا یا وجود ایک تاریخی معاملہ بن جاتا ہے۔ تاریخ کے جس حصے میں زارا کو زندہ رہنا ہے، اس سے پہلے بھی تاریخ تھی اور اس کے بعد بھی وقت چلتا رہے گا۔ زارا اگر انسانی اداروں کی تاریخ کے اب تک گزرے چھے ہزار سالوں کے بعد پیدا ہوئی تو ان چھے ہزار سالوں کی محنت کے بعد جو مادی ترقی ہوئی، انسانوں نے اپنی ضروریاتِ زندگی کے لیے جو اشیا بنائیں وہ زارا کو استعمال کرنے کے لیے مل گئیں۔ ان میں ایسی چیزیں بھی شامل ہیں جو زارا سے چند سو سال پہلے بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی نصیب نہ تھیں۔ اسی طرح ان چھے ہزار سالوں میں لوگوں کے آپسی رشتوں، فرائض اور حقوق، اداروں سے تعلق اور تربیت کے طریقے بھی بنے۔ زارا کی زندگی دراصل اسی سیاق (Perspective) میں شروع ہو رہی ہے۔ ابھی تو زارا چھوٹی ہے۔ وہ کچھ سالوں میں بڑی ہو جائے گی۔ وہ پڑھے لکھے گی۔ اگر اس کے پڑھنے لکھنے اور سیکھنے میں اسے خود مختار بنا دیا جائے تو وہ اپنی زندگی کی ترجیحات طے کرنے کے لیے فیصلے خود کر سکے گی۔ وہ ناقدانہ شعور سے اپنے ساتھ ہونے والے بھوتوں کے تجربے کے بارے میں سوچے گی۔ اگر وہ سمجھ جائے کہ اس کو جو باتیں، ورثے کے طور پر، اس سے پہلے کی سماجی تاریخ سے ملی ہیں، وہ تو دراصل اسے مجبور بنانے اور ایک تابعدار بیوی یا سگھڑ ماں بنانے تک محدود ہیں۔ جبکہ وہ اس کے برعکس محض مجبور عورت نہیں، ایک آزاد فرد کے طور پر بہت کچھ کر سکتی ہے۔ ایسے شعور کے ساتھ تاریخ سے اسے جو بھی ملا، اس کے بارے میں لوگوں کے ساتھ مکالمہ کر کے، اسے تبدیل کرنے کی کوشش کرے گی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس تبدیلی کے لیے بہت کچھ نہ کر سکے اور صرف چند ایک امکانات تلاش کر لے۔ وہ ان کے مطابق اپنی زندگی میں ترمیم کرنے کی کوشش کرے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے مشکلات بھی آئیں۔ ان ترامیم سے نہ صرف اس کی اپنی زندگی میں بہتری اور خود مختاری کی گنجائش آئے گی بلکہ اس کے بعد آنے والوں کے لیے تبدیلی کے مواقع پیدا

ہوں گے۔ زارا اپنی زندگی میں جو کچھ بھی کرے گی وہ اس کے تاریخی وجود کے لحاظ سے تاریخی ہوگا۔ اس کا حلقۂ اثر بڑا یا چھوٹا ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک فرد نے اپنے آپ کو ایک تاریخی وجود مانتے ہوئے، اپنے آپ کو انسانی تاریخ اور پوری انسانیت سے جوڑ کر تبدیلی کے لیے کوشش کی۔ یہی انسان ہونے کی شہادت ہے۔

تبدیلی کا عمل، انکشاف (Discovery) کا عمل ہوتا ہے۔ اس کی ہر سطح اور ہر گوشے میں حیرت اور تجسس ہوتا ہے۔ یہ ایسی لگن عطا کرتا ہے، جس کی جاذبیت (Absorption) میں تخلیق کا لطف (Joy of Creativity) ہے۔ یہ لطف کھانے پینے، جنسیت یا کسی بھی لذت سے بڑا ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ لُطف، کسی مقصد کو آخر کار حاصل کر لینے میں نہیں، اس عمل میں ہے جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ (Fromm, Erich) اس زمرے میں وہ معاملات بھی آتے ہیں جن کی بنیاد مذہبی یا تجریدی افکار میں ہوتی ہے۔ عبادت اپنی ذات میں لطف کا ذریعہ ہے، یہ آج تک کسی نے پلٹ کر نہیں بتایا کہ اسے عبادت کرنے کا مقصد حاصل ہوا یا نہیں۔۔۔ یہ لطف تخلیقی سائنسدانوں، انقلابیوں اور تحقیق کرنے والوں کے لیے بھی مخصوص ہے۔ ان کی لگن میں مسلسل کوشش ہی وہ وسیلہ ہے جس کی بدولت وہ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ناقدانہ شعور کے مطابق کامیابی یا ناکامی کے معانی، ان کے نزدیک کوشش کرنا ہی ہے۔ اس لگن میں ان کے دل و دماغ میں صرف ایک ہی محرک ہوتا ہے کہ ان کی کوشش سے ممکن ہے کہ انسانی زندگی میں سکھ آجائے، انسانوں کے دکھ کم ہو جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انسانوں کے ساتھ وابستگی کے اس احساس کے ساتھ وہ محنت کرتے چلے جائیں اور ان کی زندگی ختم ہو جائے۔ وہ اپنی کوشش کی منازل طے کرتے ایک مقام پر اس دنیا سے چلے جائیں۔ دوسرا شخص، اگر اسی لگن کے ساتھ اس کام کو آگے بڑھاتا جائے تو ممکن ہے کہ وہ کامیاب ہو جائے۔ کامیابی اور اس کا حقیقی لطف، دراصل کوشش کو صحیح راستے پر چلانا ہے۔

تحکمانہ نظام، دراصل انسانی صورت حال کو بگاڑنے اور انسانی صورت حال کی

سچائی (Truth) کو اپنا نام دینے کی کوشش ہے (Freire)۔ اس نظام میں جو 'حقیقتیں (Realities)' نظر آتی ہیں، وہ دراصل جعلی پن (Fake) اور فریب (Illusion) ہوتا ہے۔ اس میں انسانوں کو ان کی ذات، رشتوں اور اجتماعی زندگی سے متعلق ایک جعلی شعور دیا جاسکتا ہے۔ انسان کو اسی جعلی شعور کے مطابق ڈھالنے کے لیے سدھایا جاتا ہے۔ یہ دراصل انسانی فطرت کی خود مختارانہ حیثیت کے خلاف ایک سنگین جرم ہے۔ تبدیلی کے عمل کا اصل مقصد اس جعلی شعور اور اس کی تمام تر جزئیات کو نئے معانی دیکر تبدیل کرنا اور ان کا نیا نام رکھنا ہے۔ مثال کے طور پر اس نظام میں سب سے زیادہ پسے افراد عورتیں ہیں یا بچے۔ اس نظام میں جب بھی لفظ عورت یا بچہ کہیں تو ان کے مخصوص معانی اور متحرک کردار سامنے آجاتے ہیں۔ 'عورت، جنس کے لیے استعمال کی جانے والی مشین، بے عقل، مکار اور قابلِ نفرت شے ہے۔' بچہ، بے چارہ، بے بس، دوسروں کا محتاج، خالی دماغ اور ماں باپ پر بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ ناقدانہ شعور آئے گا تو ان الفاظ کے کہنے پر یہ تصورات نہیں آئیں گے۔ ایسے میں نئے تصورات کے لیے نیا نام رکھنا ہوگا۔ یہی صورت دیگر معاملات کی ہوگی، جیسے ناامیدی۔ یہ تقدیر یا فطری رویے کا نام نہ ہوگا۔ یہ امکانات کے ہونے یا نہ ہونے کے متبادل (Alternative) میں ڈھل جائے گا۔ زندگی مجبوری نہیں، بااختیار ہونے کے معنی رکھے گی۔

مجبوری کی صورت حال میں، مجبوروں کے درمیان ایک دوسرے کا خیال رکھنے اور یگانگت کا احساس بطور خاص پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ وسیع تر معاشرتی معنوں میں زندہ رہتا ہے اور اس میں فرد کے لیے سلامتی کی گنجائش ہوتی ہے۔ قدیم تحکمانہ نظام کی وسعت خاندان اور برادری کے ثقافتی معاملات میں قدرے کم تھی۔ جدید ریاستی نظام نے محتاجی پیدا کرنے کے لیے افراد کی بہت نجی آزادیوں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ اس طرح اس کے پھیلنے سے انسانی ہمدردی اور یگانگت کا معاشرتی احساس اور بھی سکڑ گیا۔ سڑک پر گرے شخص کی ہر شخص مدد کرنا چاہتا ہے مگر پولیس کی حاضری اور پیچیدہ قوانین کے باعث ہر فرد اس گرے یا زخمی شخص کی اعانت سے گریز

کرتا ہے۔ اس سے ہر فرد کو انسانیت اور انسانی ہمدردی رکھتے ہوئے بھی اس کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ اس صورت حال سے احساسِ شکستگی پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح پے در پے انسانیت کے احساس کی شکستگی سے ہمدردی کا پیدا ہونا ہی ختم ہو جاتا ہے۔ صرف ان گوشوں میں یہ احساس برقرار ہے جو حکومتی ڈھانچے کی دسترس سے بالکل باہر ہیں۔ انسانی احساس کا عملی اظہار کہیں بہت نیچے دب چکا ہے اور اس کی جگہ زبانی جمع خرچ نے لے لی ہے۔ دکھوں اور تکالیف میں فرد، اکیلا رہ گیا ہے۔ اس سے دوسروں پر عدم اعتماد اور بھروسے کی کمی کا پیدا ہونا قدرتی بات ہے۔ شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ مغربی ممالک میں انفرادی ہمدردی کی جگہ فلاحی اداروں نے لے لی ہے۔ وہاں انفرادی ہمدردی کے لیے لوگوں کے پاس وقت بھی نہیں۔

مجبوری کے مذکورہ تناظر میں پیار کی بات دراصل تملیک (Possession) کا ہی دوسرا نام ہے۔

مکالماتی سماج میں ہر فرد کو ایک انمول رکن سمجھا جاتا ہے۔ اس کا اعتراف ذات اس کے حالات کے تناظر میں کسی تعصب یا استعمال کے خیال سے الگ ہو کر کیا جاتا ہے۔ اس میں شریک سب لوگ فوری طور پر برابر اور مساوی ہو جاتے ہیں۔ اس برابری میں تملیک کی بجائے وابستگی کا احساس نمایاں ہوتا ہے۔ مکالماتی شعور کے تحت اگر کوئی دوسروں کے ساتھ رشتہ قائم کرلے تو اس فرد میں، پوری انسانیت آ بسے گی۔ فرد کی معاشرتی حس لوگوں کو اپنے دبدبے میں لا کر اپنی انا کی تسکین نہیں بلکہ اجتماعیت کے ساتھ وابستگی کی صورت اختیار کرلے گی۔ اگر افراد میں اجتماعیت کا یہ احساس انفرادی سطح پر ہو تو ان سے بننے والے گروہ میں اجتماعی قوت کس قدر طاقتور ہو گی۔ اس گروہ میں بسے لوگ کس قدر محفوظ ہوں گے۔ وہ کس قدر خوبصورت احساس والے انسان ہوں گے۔

وابستگی محض مجرد احساس نہیں۔ شعور کا ٹھوس تاریخی بنیادوں پر ارتقا ہی اس کی بنیاد میں متحرک رہتا ہے۔ یہ مسلسل ارتقا پذیر کیفیت ہے۔ اس کی بنیاد مکالمے اور ناقدانہ شعور پر ہو گی اور افراد اپنی

خودمختاری کو برقرار رکھتے ہوئے، وابستگی کی کلیت (Totality) میں داخل ہوں گے۔ ایسے میں تعلق کی تحریک کا مطلب استعمال کرنا یا مالک بننا نہ رہے گا۔ خودمختار ناقدانہ شعور کا حامل شخص اپنے متحرک وجود کی بنیاد پر کسی قسم کے استعمال یا استحصال کا شکار نہیں بن سکتا۔

ناقدانہ شعور جو انسان کو خودمختار بنانے کی اہلیت رکھتا ہے، اپنی ساخت کے اعتبار سے زرعی معیشت اور سرمایہ داری پر مبنی تحکمانہ نظام کے خاتمے کے لیے مؤثر ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس متبادل ساخت کی بنیاد پر نیا علم اور نیا شعور پیدا کرنا ہو گا۔ اس کے ذریعے انسانی آزادی پیدا کرنے کی صلاحیت کا ارتقاء ممکن ہے۔ مگر مکالمے کے ذریعے لوگوں کو اس کا حصہ بنانے کے لیے یقیناً وقت درکار ہے۔ یہ سفر، اپنی معنوی حیثیت میں دوبارہ پیدا ہونے والا (Rebirth) معاملہ ہے۔ یہ عمل آخرکار پیار کی ثقافت (Culture of Love) کو پیدا کرے گا۔ پیار محض جنسی کشش کا حیلہ نہیں ہے۔ یہ ایک عمومی رویہ ہے جو 'عام آدمی' کے شعور کی بنیاد ہے۔ جو لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑتا ہے۔

محتاج بنانے کے لیے سکھانا	سوال کرنے کی بنیاد پر سکھانا
● بچے کا دماغ ایک ڈبہ ہے، اس میں معلومات ڈالی جائیں گی اور انھیں یاد رکھنا چاہیے۔	● بچے میں انسان ہونے کے ناطے تجسس کی فطری صلاحیت ہے اور اس کے متحرک ہوتے ہی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ سوال کرنا ہی انسان کے ہونے کا ثبوت ہے۔
● دماغ کے ڈبے میں محفوظ معلومات کو بغیر ترمیم کیے، ہو بہو دہرا دینا ہی قابلیت ہے۔	● معلومات اگر حقیقی حالات سے رابطہ قائم کرنے میں معاون نہ ہوں تو وہ محض وقت ضائع کرنے والا معاملہ ہے۔
● تم دنیا کو تبدیل نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ جیسے ہے، ویسے ہی رہے گی۔	● انسانی ارتقاء خود تبدیلی کا ثبوت ہے۔ اگر انسان اپنے آپ اور اپنے ماحول کو تبدیل نہ کرے تو پھر اس میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اصل معاملہ انسان کو بدلنا ہے۔
● سوال کرنا بدتمیزی ہے۔ لوگوں کا پسندیدہ بننے کے لیے فرمانبرداری اور تابعداری ہی سب سے اچھا رویہ ہے۔	● اگر سوال نہ کریں تو مکالمہ نہ ہوگا۔ مکالمہ نہ ہوگا تو تبدیلی کے امکانات نہ ہوں گے۔ جب تبدیلی کے امکانات نہ ہوں تو بے بسی پیدا ہوتی ہے جسے دوسرے لفظوں میں قسمت بھی کہا جاسکتا ہے۔ سوال اور مکالمے کا عمل تبدیلی کے امکانات پیدا کرتا ہے۔ امکانات ہوں گے تو امید ہوگی۔ یہ پُر لطف سفر ہوگا۔
● تمھارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، تمھاری قسمت ہے اور اسے نہیں بدلا جاسکتا۔	● اگر باتوں کا تعلق حقیقت احوال سے نہ ہو، اور ان میں متحرک تبدیلی کا پیغام نہ ہو تو وہ صرف زبانی جمع خرچ ہی ہے۔
● کوئی بات کس قدر سچی ہے یا درست ہے، کا انحصار اس بات پر ہے کہ اسے کون کہہ رہا ہے۔ سچائی اور وقعت کا انحصار مرتبے پر ہے۔	● جسم پر مبنی زندگی، دراصل آدھی سے بھی کم حیات ہے۔ کیا آدھا آدمی، مکمل انسان ہونے کا لطف اٹھا سکتا ہے۔
● حقیقت وہ نہیں جو حالات میں ہے یا لوگ جس میں رہ رہے ہیں۔ حقیقت وہ ہے جس طرح وہ بیان کی جارہی ہے۔	
● جسم کے گرد گھومنے والی ضروریات ہی مقصد ہیں۔ انھی کو پورا کرنے کے لیے جُتے رہیں۔	
● تم سیکھنے میں آزاد نہیں، تمھیں ہر وقت استاد یا کسی اور کا محتاج رہنا پڑے گا۔ اس لحاظ سے یہ عمل یک طرفہ ہوتا ہے (One way)۔	
● سیکھنے کی بنیاد جزا اور سزا پر ہوتی ہے۔	

محتاج بنانے کے لیے سکھانا	سوال کرنے کی بنیاد پر سکھانا
● مثبت اور صحت مند جذبات (Emotions) کی بجائے جذباتیت (Sentimentalism) پیدا ہوگی جو محتاجی کی علامت ہے۔	● صرف یاد رکھنے کی بجائے، سوال کرنے والا، سمجھنے اور سیکھنے کے عمل کو آگے بڑھاتے ہوئے تنقیدی شعور (Critical Consciousness) کی طرف بڑھتا ہے۔
● محتاجی سکھانے کے لیے بچے کے اردگرد ہر ادارہ اپنی کارکردگی کے لحاظ سے دبانے والا اور جبر والا ہوگا۔	● سوال کر کے سیکھنے کے باعث، انسان میں خود اعتمادی آتی ہے۔ وہ دوسروں پر انحصار کی بجائے اپنے آپ کو خود مختار سمجھنے لگتا ہے۔
● محتاجی کے باعث اپنے آپ پر انحصار کی عادت نہیں رہتی۔ اپنے آپ پر انحصار کی عادت نہ ہو تو اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہوتا۔ اپنے آپ پر اعتماد نہ ہو تو ہر تبدیلی اور اجنبیوں کے ساتھ آیا ہر طریقہ اور سوچ، خوف اور عدم سلامتی پیدا کرے گا۔	● خود انحصاری دراصل آزادی کی طرف لے جاتی ہے۔
● محتاجی والا شعور، اصل میں غیر انسانی صورتحال پیدا کرتا ہے اور اس لحاظ سے انسانوں کو غیر انسان رہنے پر مجبور کرتا ہے۔	● سوال سے مکالمہ پیدا ہوتا ہے اور یہ سوال کرنے والوں کو انسانوں سے جوڑتا ہے۔ اس طرح سوال مکالمے کی بنیاد پر حاصل کی ہوئی خود انحصاری یا آزادی خودسری کی بجائے انسانوں سے جوڑتی ہے اور وسیع تر پیار کا رشتہ قائم کرتی ہے۔
● محتاجی والا شعور خود انحصاری پیدا نہیں کرتا۔ اس لیے حقیقی حالات سے تعلق نہ ہونے کے باعث، ضعیف الاعتقادی (Superstitions) پر انحصار کیا جاتا ہے۔	● سوال اور مکالمے کی بنیاد پر پیار کی ثقافت کا قیام ممکن ہے۔
● محتاجی والا شعور دراصل زندگی اور زندہ رہنے کے لطف کو ختم کر کے قبرستان کا ماحول بنانا چاہتا ہے۔ قبرستان میں انسان ہوتے تو ہیں مگر سب مردہ ہوتے ہیں۔ قبرستان ایک بستی تو ہے مگر وہاں انسانوں سے متعلق زندگی نہیں ہوتی۔	● سوال اور مکالمے کی بنیاد پر بننے والا سیکھنے کا عمل یکطرفہ رہنے کی بجائے دوطرفہ ہوتا ہے۔
	● سوال اور مکالمے سے خود اعتمادی آتی ہے تو پوری شخصیت نئے سرے سے پیدا (Rebirth) ہونے لگتی ہے۔ ایسے میں ٹھہراؤ آتا ہے۔ جذباتیت یا کمزور جذبات کی بجائے متوازن جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جذبات کمزوری کی بجائے طاقت کا باعث بنتے ہیں۔

کتابیات

1- Harman, Chris,
A Peoples History of the World
Orient Longman, New Delhi, 2006.

2- Beauvoir, Simone de,
The Second Sex Translated by M. Parshley,
Penguin Books, 1977.

3- Marx, Karl,
Selected Writings in Sociology and Social Philosophy
Edited by T. B. Bottomore and Maximilein Rubel,
Penguin Books-1961.

4- Hauser, Arnold,
The Social History of Art (Part I), London, 1984.

5- Jung C. G.
Psychological Types, London, 1946.

6- Fromm, Erich
Psychoanalysis and Religion, U.S. 1961
- **To Have or To Be**, New York, 1981.
- **The Art of Loving**, New York, 1972.

7- Freire, Paulo,
A Pedagogy for Liberation, London, 1982.
- **Pedagogy of the Oppressed**,
Penguine Books. 1972.